

سید احمد سعید

کئی

صحیح تصویر

ویدیا کسٹوڈ



سید احمد شہید  
کئی

صحیح تصویر

وچند احمد سعید

رضا پبلی کیشنز لاہور

marfat.com

Marfat.com

جیلہ حقو، محفوظ

بیاد: امام اہل سنت مجدد دین و ملت، نائب غوث اعظم  
امام احمد رضا خان قادری بریلوی قدس سرہ العزیز  
بفیضان نظر: حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمہ

کتاب----- سید احمد شہید کی صحیح تصویر

مصنف----- وحید احمد مسعود

تعارف----- پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

صفحات----- 244

تعداد----- گیارہ سو

اہتمام----- صاحبزادہ میاں زبیر احمد علوی تنج بخش قادری ضیائی

اشاعت چہارم----- ماہ غوث اعظم ۱۴۲۳ھ، جون 2003ء

ناشر----- رضا پبلی کیشنز۔ لاہور

قیمت----- 100 روپے

تقسیم کار

فرید بکسٹال۔ اردو بازار۔ لاہور

marfat.com

Marfat.com

اس کتاب کے اس سے قبل تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تیسرا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۶۷ء میں مکتبہ مسعود، مسجد گراؤنڈ رام گڑھ لاہور نے شائع کیا تھا، پھر کچھ عرصہ بعد کتاب کے مصنف شیخ وحید احمد مسعود فریدی صابری بدایونی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۹۷۷ء) نے اس کتاب میں ترمیم و اضافہ کے بعد تصحیح شدہ و مستند نسخہ حضرت مخدومی حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ، لاہور (متوفی ۱۹۹۹ء) کو ارسال فرمایا۔ اسی تصحیح شدہ نسخہ کو احقر راقم الحروف نے بڑی دیدہ ریزی سے دوبارہ صاف کر کے نقل کیا، تصحیح شدہ نسخہ بقلم مصنف علیہ الرحمۃ جناب میاں زبیر احمد علوی گنج بخش قادری ضیائی مدظلہ لاہور کے پاس محفوظ ہے۔

خلیل احمد رانا

جہانیاں

## پیش گفتار

جناب ”سید احمد شہید“ اور ان کی ”تحریک جہاد“ کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ان کے عقیدت مندوں اور ان کی تحریک جہاد کے روح و رواں جناب شاہ محمد اسماعیل صاحب کے مقلدوں کے اذہان کی پیداوار ہے اور ہر تذکرہ نگار نے اپنا نیا راگ الاپا ہے، کسی نے بھی عقیدت کی عینک اتار کر اصلیت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ سارا زور قلم سید صاحب کو مامور من اللہ، معصوم عن الخطاء، مجدد وقت، امام زمان اور تحریک آزادی کا ہیرو ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے، مگر پھر بھی نتیجہ لا حاصل اور ہر ذی شعور انسان ان ضخیم و ضخیم تذکروں کو بہ نظر غائر پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجے پہنچتا ہے، کہ اس تحریک کے مایہ ناز مورخوں سے بات نہیں بنی، اور ان سے وہ بات بھی چھپائی نہیں جاسکی، جس کو چھپانے کے لئے انہوں نے اس قدر مغز مارا ہے اور بے چارے محمد جعفر تھا عیسری کو تحریف کا مرتکب ”ثابت“ کر کے اس کے کفن کو داغدار کیا ہے۔

ہاں یہ تذکرے عقیدت مندوں اور اندھے مقلدوں کے قلوب کو بہلا سکتے ہیں، گوان کے دماغوں کو اپیل نہ کریں، مگر دل کا بہل جانا بھی تو بڑی بات ہے۔ ایسے تذکروں کو لکھ اور پڑھ کر اگر ایک خاص گروہ کے دل بہل جاتے ہیں تو یہ اپنی جگہ ٹھیک، مگر تاریخ کو مسخ کرنے اور زید کی پگڑی بکر کے سر رکھنے کی اجازت دے دینا، بہت بڑا ظلم ہے، چنانچہ تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کی خاطر جناب مولانا وحید احمد مسعود مصنف کتب کثیرہ نے ان موقع شناس قلم کاروں کے خلاف اپنے قلم حقائق رقم کو حرکت میں لا کر ان کی مصلحت آمیز تحقیقات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا، اور جناب ”سید احمد شہید“ کی صحیح تصویر کھینچ کر عوام کے سامنے پیش کر دی ہے، محترم مولانا وحید احمد مسعود صاحب یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے کر اپنے فرض سے

سبکدوش ہونے کے علاوہ اہل علم کے شکر یہ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ جزاء اللہ تعالیٰ خیراً۔  
 پیش نظر کتاب ”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“ جناب مولانا مسعود صاحب نے  
 ماہ نامہ ”منادی“ دہلی بات ستمبر ۱۹۶۵ء کے خاص نمبر کی صورت میں شائع کروائی تھی  
 اور مدیر ”منادی“ نے اپنے ادارتی نوٹ (۱) میں بڑی فراخ دلی سے دعوت دی تھی، کہ  
 اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو ”منادی“ کے صفحات اس کے لئے حاضر  
 ہیں، مگر آج تک مدیر صاحب کی دعوت کو کسی نے شرف قبولیت نہیں بخشا، ظاہر ہے کہ  
 ان سے ان کے مریدین نے وجہ خاموشی ضرور دریافت کی ہوگی، مگر منطقیانہ جواب  
 دے کر ٹال دیا ہوگا۔ لیکن جواب نہ دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عافیت اسی میں  
 سمجھی کہ جواب نہ دے کر جواب الجواب کی زد سے بچا جائے اور بذریعہ خاموشی اس  
 اٹھ کھڑے ہوئے مسئلے کو ختم کر دیا جائے، وگرنہ بنا بنایا گھیل خراب ہو جائے گا، (۲) مگر  
 یہ خیال خام ہے۔

جملہ تذکرہ نویسوں کے بقول جناب سید صاحب متنوع خوبیوں کے مالک  
 بزرگ تھے، لیکن ان کی بنیادی اور سب سے اہم خوبی ان کی بے پناہ روحانیت اور  
 کمال ولایت ہے اور ان ہی کمالات عالیہ کی بدولت انہوں نے تسخیرِ خلایق کی تھی اور  
 روحانیت کے زور سے لوگوں کو آمادۂ جہاد کیا تھا، اور سلاسل فقر میں ایک نئے سلسلے  
 (طریقہ محمدی) کا اضافہ کیا تھا۔۔۔ لہذا سید صاحب کی ذات کو پہچاننے کے لئے  
 سب سے اول ان کی اس مبینہ حیثیت کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور حاصل بحث یہ ہے  
 کہ جناب کی یہ حیثیت بھی مشتبہ ہے، اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آج محمدی  
 سلسلہ معدوم ہے اور اس وقت اس ”عظیم“ سلسلے کا کوئی شیخ نظر نہیں آتا، اور اسی  
 معدومیت کی بنا پر خود معتقدین سید صاحب میں سے دیوبندی گروپ کے لوگ  
 دوسرے سلسلوں میں بیعت ہوتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فیضان ولایت محمدی

۱۔ یہ نوٹ افتتاحِ سخن کے زیر عنوان ص: ۹ پر درج ہے۔

۲۔ اب یہ کتاب تیسری بار شائع ہو رہی ہے، مگر تا حال کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ (محمد موسیٰ)  
 اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چوتھا ایڈیشن مفید اضافوں کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے، مگر اس کا جواب ابھی  
 تک نہیں آیا۔ (میاں زبیر احمد)

نہیں تھا بلکہ جناب شاہ صاحب کے علم و فضل کی کرشمہ سازیاں تھیں، غرض کہ جناب مصنف نے سید صاحب کی روحانی کیفیت کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔

مسائل تصوف عوام تو کجا بہت سے مولویوں کے فہم سے بھی بالا ہوتے ہیں، لہذا اس بحث کو پڑھ کر وہی لوگ پورے طور پر محفوظ ہو سکتے ہیں جنہوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھا ہے لیکن عوام کی دلچسپی کے سوالات یہ ہیں:-

----- سید صاحب کے جہادکارخ انگریزوں کی جانب تھایا سکھوں کی طرف؟

----- سید صاحب نے تحریک جہاد کا آغاز انگریزوں کے اشارے پر کیا تھایا حکم الہی سے؟

----- سید صاحب نے انگریزی علاقے میں کھلے بندوں جہاد کی تیاری کی اور چندہ جمع کیا، مگر انگریز آڑے کیوں نہیں آئے؟

----- سید صاحب اگر انگریز کے مخالف تھے تو انہیں انگریزی عملداری سے سرحد میں مدد کیوں پہنچتی رہی؟

----- سید صاحب کو انگریزی عملداری سے باہر ہر مقام پر انگریزوں کا جاسوس کیوں سمجھا گیا؟

----- سید صاحب کی دعوتیں انگریزوں نے کیوں کیں؟  
----- سید صاحب نے غیر ملکی انگریزوں کو نکالنے کے لئے سکھوں سے کوئی بات چیت کی تھی؟

----- سید صاحب نے سکھوں کے علاوہ سرحدی و قبائلی پنھانوں کا جو خون بہایا کہاں تک جائز تھا؟

----- سید صاحب مجدد تھے تو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کر کے انہیں متحد و متفق کیا یا بیسیوں اختلافی مسائل پیدا کر کے باہمی سرپھٹول میں مبتلا کر دیا؟

----- سید صاحب کے حکم سے بیوگان کے زبردستی نکاح کر دینے میں

کون سی دانشمندی تھی؟

ان سب سوالوں کے جواب اس کتاب میں موجود ہیں، مگر تفصیل کے بجائے اشاروں کنایوں سے دیئے گئے ہیں جو حقیقت کے متلاشی کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہیں، ہٹ دھرمی، ضد اور تعصب بے جا کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“ کی اشاعت یہاں بے حد ضروری تھی، کیونکہ پاکستان ہی میں سب سے زیادہ اس تحریک کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے، کارکنان رضا پبلی کیشنز۔ لاہور مستحق صد ستائش و مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے تصویر کا صحیح رخ عوام کے سامنے آجائے گا، محققین کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور یہاں کے عقیدت مند مصنفین جانبدارانہ تحقیقات کو چھوڑ کر حقیقت کو تلاش کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

محمد سعید نعمانی  
(محمد موسیٰ عفی عنہ)

۲۴ جولائی ۱۹۶۶ء  
لاہور



زیر حوالہ کتاب: ”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“ از وحید احمد مسعود (لاہور۔ مکتبہ مسعود ۱۹۶۶ء) کا اندراج ”فہرست ذخیرہ کتب حکیم محمد موسیٰ امرتسری (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)“ مرتبہ سید جمیل احمد رضوی کی جلد چہارم (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء) کے صفحہ ۹۹ پر کیا گیا ہے (شمارہ انداج: ۷۲۳۷)۔ مرتب نے اس اندراج کے ذیل میں ایک نوٹ دیا ہے:-

”اس کا پیش گفتار (از صفحہ ۶۳۳) محمد سعید نعمانی کے نام سے شائع ہوا۔ ۲۵ جون ۱۹۹۸ء کو حکیم صاحب نے اس نام کے سامنے خط دے کر اپنا اسم گرامی (محمد موسیٰ عفی عنہ) لکھا ہے۔ گویا یہ تحریر حکیم صاحب کی ہے (دیکھئے ۶)“

فہرست کی جلد چہارم پر تبصرہ رسالہ: ”نقطہ نظر“، اسلام آباد (اپریل۔ ستمبر ۲۰۰۲ء) کے صفحات ۱۰۱ اور ۱۰۲ پر شائع ہوا۔ تبصرہ نگار نے درج بالا اقتباس کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے (ص ۱۰۲)

”جناب سید جمیل احمد رضوی نے ترتیب فہرست میں اس امر کا خیال رکھا ہے کہ اگر کسی کتاب پر حکیم صاحب نے کوئی اہم یادداشت لکھی ہے تو اسے نقل کر دیا جائے۔ اس حوالے سے زیر نظر ”جلد چہارم“ میں ”صاحب ذخیرہ“ کے بارے میں یہ اطلاع غالباً پہلی بار سامنے آئی ہے کہ وحید احمد مسعود کی تالیف ”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“ (مکتبہ مسعود۔ لاہور، ۱۹۶۶ء) کے دیباچہ نگار ”محمد سعید نعمانی“ کے پردے میں اصلاً حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی ذات گرامی تھی (ص ۹۹)۔“

میاں زبیر احمد علوی گنج بخش قادری ضیائی

## افتتاح سخن

اس حقیقت سے کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر کے صوفی بزرگ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد ان عقائد سے مختلف تھے جو آج ان کے مبینہ پیروکاروں کا طرہ امتیاز ہیں اور جن کی وجہ سے چشتی صابری نسبت کے باوجود دیوبندی اسکول کو تصوف اور چشتیت کے لئے ایک تہمت سمجھا جانے لگا ہے، پیرومرشد کے عقائد اور طریقہ کار سے ایسا اختلاف حیرت انگیز بھی ہے اور تصوف کی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال بھی نہیں ملتی، تاہم عام لوگ اب تک اس اختلاف کی وجوہات سے ناواقف تھے اور انہیں اس تاریخی پس منظر کی بھی خبر نہ تھی، جس میں یہ اختلاف رونما ہوا، لیکن حال میں حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی قصبی کا ایک بصیرت افروز مقالہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایسا شائع ہوا، جس نے ہر چیز کی وضاحت کر دی اور عقائد اور طریقہ کار کا یہ اختلاف عام لوگوں کے لئے بھی کم از کم حیرت انگیز نہیں رہا۔

ناظرین کو مولانا فریدی کا یہ مقالہ یاد ہوگا، کیونکہ اسے ”منادی“ میں بھی شائع کیا گیا تھا اور اس کے بعد مشہور صحافی مولانا غلام رسول مہر کے جواب اور مولانا فریدی کے جواب الجواب کے طویل سلسلے کو بھی ناظرین نے فراموش نہ کیا ہوگا جس کا ”منادی“ میں باقاعدگی سے اندراج ہوتا رہا، اور جس سے عوام و خواص سب نے بے انتہا دلچسپی لی، اس دلچسپ بحث میں سب سے زیادہ گفتگو حضرت سید احمد شہید کے بارے میں رہی، کیونکہ ان کے متعلق مولانا فریدی کے بعض ریمارکس مولانا مہر کو شاق گزرے تھے، اور انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ مولانا فریدی کو اس کا جواب دیا تھا، منادی اس ساری بحث کو غیر جانبداری کے ساتھ چھاپتا رہا اور موافقت مخالفت

میں کوئی رائے نہیں دی اور نتائج اخذ کرنے کے لئے ناظرین کے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا وحید احمد صاحب فریدی کا زیر نظر جامع مقالہ بھی (جس پر منادی کا یہ خاص نمبر مشتمل ہے) اسی بحث کا ایک حصہ ہے اور سابق کی طرح اب بھی منادی غیر جانبداری کو قائم رکھتے ہوئے اور کوئی رائے دیئے بغیر اسے بے کم و کاست ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے، اب تک منادی میں مولانا مہر کے جوابات بھی چھپتے رہے تھے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا فریدی کا یہ مقالہ ہندوستان پاکستان کی موجودہ جنگ کے باعث مولانا مہر کی نظر سے جلدی نہ گزر سکے گا۔ تاہم مولانا مہر کے ہم خیال ہندوستان اور ان غیر ممالک میں بھی کم نہیں جہاں منادی جنگ کے دوران میں بھی بھیجا جاسکے گا۔ اس لئے ان میں سے اگر کوئی صاحب مولانا فریدی کی رائے سے اختلاف کرنا چاہیں تو ان کے لئے منادی کے صفحات حاضر رہیں گے اور امن ہونے کے بعد مولانا مہر بھی اگر اس کا جواب لکھنا چاہیں گے تو اس کو بھی شکرے کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کے دونوں رخ رہیں اور وہ کسی صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں۔

یہ ایک علمی اور تاریخی بحث ہے، اس سے کسی کو برا نہیں ماننا چاہیے، سنجیدگی سے غور کیا گیا اور لوگ تعصب میں مبتلا نہ ہوئے تو ان شاء اللہ اس سے افہام و تفہیم کی راہ نکلے گی اور اختلافات کی خلیج پائٹنے میں مدد ملے گی، کیونکہ اب تو حالت یہ ہے کہ تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم نامی کتابوں کا ذکر کرتے ہی خانقاہی حلقے وہابیت کے خطرے سے چونک پڑتے ہیں اور ان کے سامنے وہ روایت آجاتی ہے کہ شاہ اسماعیل جب سکھوں سے لڑنے جانے لگے تو دلی میں انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی بابت کہا کہ ”سکھوں کی مہم سے فارغ ہو جاؤں تو اس بت خانے کو بھی ڈھاؤں گا“۔ (۱)

۱۔ شاہ صاحب نے یہ بات اس لئے کہی ہوگی کہ انہیں یہ یقین تھا کہ انگریزوں کی اس خواہش کو پورا کر دیں گے، کیونکہ ان کے تعلقات انگریزوں سے ایسے ہی تھے۔ (محمد موسیٰ)



اس طرح سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل وغیرہ سے ذہنی طور پر وابستہ طبقہ اور دیوبندی اسکول، خانقاہ اور درگاہ کا نام آتے ہی بدعت اور شرک کے ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور ذرا نہیں سوچتا کہ جس چیز کو وہ بدعت اور شرک سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت بدعت اور شرک ہے بھی یا نہیں اور اس کے ذہن میں اس واقعے نے کس طرح اور کیوں جگہ پائی ہے، اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات بیان کرنے کے قابل ہے کہ مولانا قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ میں اجمیر شریف گیا تو ڈر رہا تھا کہ ابھی کوئی خادم آئے گا اور زبردستی میری گردن پکڑ کر مزار کے سامنے سجدہ کرنے کے لئے مجبور کرے گا، لیکن جب میں وہاں پہنچا تو گردن پکڑنا تو الگ رہا کسی نے زبان سے یا اشارے کنائے تک میں مجھ سے سجدے یا آستان بوسی کے لئے نہیں کہا اور سب لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور میں نے اپنے عقیدے کے مطابق حاضری دی۔

ناظرین ”منادی“ حضرت مولانا وحید احمد صاحب سے بخوبی واقف ہیں، ان کو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد امجاد میں سے ہونے کا فخر حاصل ہے اور مشرقی و مغربی قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیمات سے بہرہ ور ہیں، ایک عرصے تک انگلستان میں رہے، تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا، حکومت یو۔ پی کی پارلیمنٹری سیکرٹری کی حیثیت سے پیش بہا خدمات انجام دیں، گوشہ نشینی، ترک و تجرید اور مجاہدات سے بھی آشناء ہے، غرض یہ کہ وہ ہمہ صفت موصوف بزرگ ہیں اور ایک دنیا ان کی دیکھی ہوئی ہے، ان کے سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا انداز تقلید سے آزاد ہے، ان کے نزدیک تاریخ ایک پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے، وہ تاریخ کو بس گواہ اور شاہد سمجھتے ہیں اور اس کے طے شدہ اور ریڈی میڈ فیصلے نہیں مانتے اور جو تاریخ اس قسم کے فیصلے دیتی ہے، اس کو ایجاد بندہ سمجھتے ہیں، وہ دروغ کو راوی کی گردن پر رکھ کرے فکر نہیں ہو جاتا بلکہ راوی کی گردن کو اس کے بوجھ سے ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور آخری فیصلے اور حکم کا حق راوی کے بجائے اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں اور فیصلہ دیتے

وقت کسی قسم کی رورعایت پسند نہیں کرتے، ان کا فیصلہ تذبذب سے پاک اور دونوں کو ہوتا ہے، اکثر اوقات اس سے سنگدلی ٹپکتی ہے اور قائم شدہ عقیدوں اور تصورات کو ٹھیس پہنچتی ہے، عدل و انصاف میں فریدی صاحب رحم دلی جائز نہیں سمجھتے، شاید اس لئے کہ یہاں کرپشن کا روپ دھار لیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں مولانا فریدی نے حضرت سید احمد شہید کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے، لیکن یہ تصویر کسی قدر دھندلی ہے، اس کے نقوش واضح نہیں، مولانا کا زیادہ وقت ان تصویروں کو ضائع کرنے میں صرف ہوا ہے جو دوسروں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اصلیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور لوگوں کے تصورات کی پیداوار ہیں، ان تصویروں سے محروم ہونے پر لوگ کڑھیں گے، کیونکہ یہ تصویریں بہت خوبصورت اور بڑی دلکش تھیں، ان کے بدلے میں فریدی صاحب کی بنائی ہوئی جو تصویر لوگوں کو ملے گی وہ بری نہ سہی لیکن اتنی حسین بھی نہیں ہے لیکن حقیقت پسند آدمی کے لئے اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہو سکتا ہے؟

اگر مولانا فریدی کی رائے مان لی جائے اور ان کے فیصلے کو صحیح اور قطعی اور آخری فیصلہ سمجھا جائے تو ہندوستان کی تمام ”نیم وہابی“ تحریکوں کا سرچشمہ ایک ایسی تحریک قرار پائے گی، جس کو ایک غیر مسلم اور غیر ملکی اقتدار یعنی انگریزوں کی شہ پر شروع کیا گیا تھا اور جس کے بعد کے آنے والے بے سمجھے بوجھے باپ دادا کا قابل احترام ورثہ سمجھتے رہے اور جس کی خاطر اپنے اصل راستے سے بھٹک جانے میں بھی انہوں نے کوئی قباحت محسوس نہ کی۔

امید ہے مولانا فریدی کے اس بصیرت افروز مقالے سے کما حقہ فائدہ اٹھایا

جائے گا۔

حسن ثانی نظامی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## فاتحہ

حمد بے حد ہے خدائے پاک کی اور نہایت ادب سے مصطفیٰ جانِ رحمت پہ  
لاکھوں سلام۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ہے، ایسا شکر جس کی نہایت نہیں، رسول اللہ علیہ  
الصلوٰۃ والسلام کی مہربانی ہے، ایسی مہربانی جس سے اخلاق الہی حاصل ہوتے ہیں  
اور بزرگان دین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی توجہ ہے، جو ہر وقت ہدایت کرتی رہتی ہے کہ  
یہ رسالہ تکمیل کو پہنچ سکا، میں اپنے احباب و معاونین کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر  
اسمائے گرامی ظاہر کرنے کی ممانعت ہے، حکمت اسی میں ہے کہ ید بیضا بغل میں  
رہے، مگر میری دعائے خیر ان تک پہنچ جائے گی، میں ان حضرات سے معافی کا  
خواستگار ہوں جو میری اس کاوش کو منجملہ مخالفت و اعتراض سمجھیں، ان سے میری یہی  
التجاء ہے کہ اپنے گمان کو دور کریں اور قابل اعتراض امور کی میری کوتاہی سمجھ کر اصلاح  
فرمادیں، ان کا یہ کرم میرے اور ان کے بلکہ سب کے حق میں مفید ہوگا، ورنہ میری تسلی  
کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ تنقید عقیدت مندی کی تاریکیوں کو کسی قدر چھانٹ دے گی یا  
انہیں اور زیادہ تنگ نظر بنا دے گی۔ میرا مدعا بیت بازی نہیں ہے بلکہ اتحاد بین المسلمین  
ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ رسالہ حضرت سید احمد شہید کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان تذکروں کی جو  
ان کے متعلق اس وقت تک لکھے گئے ہیں، ایک تنقید ہے، سوانح نویسوں نے حضرت



سید احمد کو نہیں سمجھا اور کریکٹر کو نباہنے کی طرف توجہ نہیں کی، عقیدت مندی نے ذمے پہلو کو سمجھنے نہیں دیا، کبھی آسمان کی کہہ دی اور کبھی زمین کی لکھ دی، یہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام ہیں، لہذا سید صاحب کی عظیم شخصیت معمر بن کر رہ گئی، ان کے سوانح یہی ظاہر کرتے ہیں کہ پیش برد و بیچ، نہ انہیں ملا سمجھا جاسکتا ہے نہ طیب بتایا جاسکتا ہے، نہ ولی کہا جاسکتا ہے اور نہ عالم، ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ان کی شخصیت کا تعین کیا جائے کہ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، پھر اسی معیار سے ان پر روشنی ڈالی جائے۔

وہ مرشد تھے؟ شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی (بڈھانوی) ان کی پانکی پکڑ کر ادباً پیدل چلا کرتے تھے، لیکن بعد میں یہی ادب گستاخیوں میں منتقل ہوتا چلا گیا، ان کے احکامات کی تعمیل نہیں کی گئی، گویا سید صاحب کی روحانیت شاہ اسماعیل کے ظاہری علم کی تعظیم کرنے لگی، اگر وہ ولی تھے؟ تو ان کی کرامتیں معجزات سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں، باوجود ان کی بے نفسی و عجز کے غصہ و غضب کے آثار بھی دکھائے گئے ہیں، مدینہ منورہ میں بحالت خواب سید الکونین علیہ السلام سے جو بے تکی گفتگو کی ہے، اس میں ادب کا شائبہ نہیں، واقعہ پشاور کے بعد، وقت وداع سب کو بیعت سے آزاد کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ:-

”مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جیسے کسی کو قے سے ہو۔“ معصومیت اور ولایت کی مکمل تردید ہے، اگر وہ بہادر اور سپاہی تھے تو سرحد میں وہ اپنی بہادری اور سپہ گری کے جوہر نہ دکھاسکے، اگر ان کو عالم سمجھ لیا جائے؟ تو انہیں وہی علم حاصل تھا، مگر وقت ضرورت ان کی علیست روپوش ہو گئی، اخلاق کریمانہ کی دھوم ہے مگر جب داغ لگا ہوا گوشت سامنے آیا تو دال پر گزر کی اور پکانے والے کو سخت الفاظ سے یاد کیا، ان کے جو اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں تناقص پایا جاتا ہے، ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہیں مگر یہاں جہاد نہیں کرتے، انہوں نے سکھوں سے جہاد کیا لیکن اس جہاد کے متعلق جتنی پیشین گوئیاں کیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں نکلی، پنڈاریوں میں رہ کر شب خون مارنا سیکھا، حالانکہ حدیث اس کی ممانعت کرتی ہے کہ بے خبری میں حملہ نہ کیا

جائے، مسلمانوں کی درخواست کہ جہاد ہندوستان میں انگریزوں سے کیا جائے، مسترد کر دیا، اس لئے کہ ان کے خیال میں انگریزوں سے جہاد کرنا بلوہ کے مترادف تھا، ظاہر ہوا کہ وہ انگریزوں کے مداح و معترف تھے۔

سید صاحب کا پہلا تذکرہ ”سوانح احمدی“ یعنی ”تاریخ عجیبہ“ ہے، اس کے مصنف محمد جعفر تھانیسری کی قابلیت و دیانت میں کلام نہیں، اس نے خود لکھا ہے کہ: ”میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، بارہ برس کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد میری والدہ نے مجھے تعلیم دلوائی۔ ۱۸۵۶ء میں عرضی نویسیوں کے زمرہ میں داخل ہوا، تمام وکیل مجھ سے قانونی مشورے لیتے۔“

آمدنی خاصی تھی مگر عدالتوں سے حاصل کئے ہوئے روپیہ کو وہ اپنے صرف میں نہیں لاتا تھا اور اس کو حرام سمجھتا تھا، بعد غد روہ پٹنہ کے مولوی سخی علی کا شریک کار ہو گیا، ان دونوں نے ۱۸۶۳ء کی مذہبی سازشوں کے قیدیوں میں نمایاں جگہ حاصل کی۔ یہ دونوں مخلص و با اصول انسان تھے، انہیں سزا ہوئی، سر رابرٹ ایڈورڈ نے مقدمہ انبالہ کے فیصلہ میں جعفر کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور سزا کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں، لہذا اس کی سزا میں تخفیف نہیں ہو سکتی، جب کالے پانی سے رہائی پا کر ۱۸۸۳ء میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے کتابیں لکھیں، سوانح احمدی ان کی مشہور کتاب ہے اور مستند ہے، انہوں نے خود اعلان کیا ہے کہ قریب چار سو صفحات کے مختلف مؤلفوں کے لکھے ہوئے سوانح میرے سامنے ہیں، مگر میں نے ان پھولوں سے عطر کھینچ لیا ہے تاکہ ہر کہ و مہ اس کا پھویا لے کر معطر ہو جائے، بایں اختصار اہم مطالب کو فوت نہیں ہونے دیا ہے، گو کہ قیمتی کراماتی واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔

۱۔ سید صاحب کے متعلق جتنا مواد ممکن تھا، وہ انہوں نے فراہم کر لیا، ان کی تحقیق قابل داد ہے، ان کے تدین کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی ناکامی کے اسباب جو ان کی سمجھ میں آئے وہ صاف صاف لکھ دیئے، برخلاف ان کے دوسرے تذکرہ نویس سخن سازی و تاویل کے ذریعے ناکامی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، سولہ برس کی عمر میں انہوں نے شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان پڑھی اور اس جماعت پر

ایمان لے آئے، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی جماعت میں شمار کئے جاتے ہیں۔  
کالے پانی کی سزا ان کو دی گئی تھی۔

۲۔ حیات طیبہ میں مرزا حیرت دہلوی نے تمام سہرے شاہ اسماعیل کے ر  
باندھے ہیں اور اس کے ضمیمہ میں ادب و عقیدت مندی کے ساتھ سید صاحب کا ذکر  
خیر کیا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ ولی اللہی تحریک کے اجراء میں مولوی عبدالحی  
(بڈھانوی) اور شاہ اسماعیل کو سید صاحب پر تقدم حاصل تھا، اس تذکرہ کی روایات  
میں بعض جگہ اختلاف ہے، لیکن اس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنا کہ ان کا ذریعہ  
معلومات غلط تھا، صحیح نہیں (اور نہ ان کی رائے اور معیار کو غلط سمجھا جاسکتا ہے)

مرزا حیرت نے خود لکھا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے۔۔۔ سمجھ لیا  
جائے گا کہ میں نے بزرگ سید کے صحیح حالات لکھے ہیں اور دوسرے سوانح نویسوں کی  
طرح ڈھکوسلہ بازی نہیں کی ہے، چاہے اس سے دلچسپی لے اور چاہے تسکین کرے،  
اور سید صاحب سے (نواب ٹونک) وزیر الدولہ کو جب اعتقاد تھا تو (پنجاب سے  
واپس آنے والے ہمراہیوں کو) وقعت پیدا کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی، سو اس  
کے کہ ان کے غائبانہ پیر کی مدح سرائی کریں اور ایسی ایسی کراہتیں اس بزرگ سید کے  
سر چسکیں جن سے ان کی ذات مبرا تھی۔ (حیات طیبہ ص ۵۲۹)

۳۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کے رشحات قلم کا  
نتیجہ ہے، وہ سید صاحب کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں، سید صاحب کے متعلق جو  
خانگی روایات تھیں، وہ بھی درج کی ہیں، اسی لئے دوسرے تذکرہ نویسوں پر انہیں  
فوقیت حاصل ہے، نہایت خوبی و احتیاط سے انہوں نے حالات لکھے ہیں، مگر کریکٹرنہ  
نباہ سکے اور تناسب جاتا رہا۔

۴۔ ”منظورہ“ سید جعفر علی گورکھپوری کی غیر شائع شدہ تصنیف ہے، اس میں  
انہوں نے اپنے ذاتی چشم دید واقعات درج کئے ہیں، جناب مولانا غلام رسول مہر  
صاحب کا اصل ماخذ یہی ہے۔

۵۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب کی ”سید احمد شہید“ معرکہ الآرا ضخیم تالیف



ہے۔ بڑی جانکاہی سے معلومات فراہم کروائی ہیں اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مفصل حالات لکھے ہیں، ان کا ذخیرہ معلومات لا جواب ہے، اور ہر معاملہ و واقعہ کو اتنی وضاحت و قابلیت سے لکھ دیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کی زحمت نہیں گوارہ کرنی پڑتی، مبالغہ آمیز مدح کرنا اور قصیدے پڑھنا شاعر کا کام ہے مگر سوانح نگار کے لئے یہ طرز مناسب نہیں ہے، مگر جناب مہر صاحب کی عقیدت مندی اس عیب کی روادار ہے، انہوں نے سید صاحب کو افسانوی ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے، صحیح ربط و مدارج کا ان کے یہاں بھی پتا نہیں چلتا جس کی وجہ سے تصویر بھدی ہو گئی ہے، ان سب کتابوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے اور موازنہ کیا جائے تو دماغ چرخ ہو کر رہ جاتا ہے اور کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل داستان طلسم ہوش ربا کا نمونہ ہے، ہر مؤلف نیا ترانہ الاپ رہا ہے۔ ان حضرات نے محض اپنے نظریہ اور عقیدت کے مطابق روایات کا انتخاب کیا ہے اور بقیہ کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت تھی کہ دقت نظر سے جملہ روایات پر تنقید کر کے نتیجہ نکالا جاتا، سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی، وہ اپنی کیفیات میں محورہ کر اصلاح کرنا چاہتے تھے، ان و آں کی انہیں پرواہ نہیں تھی، مگر حاشیہ نشین اور ارادت مندان کی اصلاح کو مادی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور عجیب انداز میں بیان کیا کرتے تھے، لہذا یہ مضمون صادق آیا!

”ولیکن قلم در کف دشمن دست“

شاہ اسماعیل کو ترجمانی کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، سید صاحب کے اصولوں کو انہوں نے اپنی قابلیت سے اپنی زبان میں ادا کیا، معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحی (۱) (بڈھانوی) کی حیات میں شاہ اسماعیل احتیاط سے کام لیتے تھے، مگر مولوی عبدالحی کی عدم موجودگی میں اور ان کی وفات کے بعد وہ مختار کل بن گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے حالات مولوی عبدالحی کی وفات سے پہلے اور وفات

۱۔ مولوی عبدالحی ابن شیخ ہبہ اللہ، بڈھانہ ضلع مظفرنگر (یو۔ پی، بھارت) کے رہنے والے تھے، شاہ شاہ عبد العزیز دہلوی کے داماد تھے، سید احمد رائے بریلوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء بروز اتوار کو عارضہ بوا سیر میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ علماء ہند، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص: ۲۸۷) غلیل احمد رائے۔

کے بعد دو لخت نظر آتے ہیں، مولانا عبید اللہ سندھی نے اسی حقیقت کو اپنی سیاہی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ مولوی عبدالحی کی وفات کے بعد مرکز دہلی کی اہمیت جاتی رہی، دہلی سے یعنی شاہ محمد اسحاق سے تعلقات منقطع کر لئے گئے اور نیا مرکز سرحد میں بنا لیا گیا، مطلب یہ ہوا کہ شاہ اسماعیل کی علمیت و مصلحت اجازت دیتی تھی کہ سید صاحب کی تصویر جس رنگ میں چاہیں کھینچیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز نے جب شاہ اسماعیل کے بجائے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ شاہ اسماعیل کو تخت شعور میں مایوسی نہ ہوئی ہو، ایسی حالت میں شاہ اسماعیل کو اپنی وجاہت قائم رکھنے کے لئے نیا راستہ بنانا تھا اور وہی بنا بھی لیا، ابتداء میں مولوی عبدالحی کی سرپرستی حاصل کر کے شاہ اسماعیل، شاہ محمد اسحاق سے ملتے رہے اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے جہاد کا منصوبہ گانٹھا، سید صاحب کے مرید ہونے کے بعد تعلقات ترک نہیں کئے، بلکہ ایک قسم کا بعد اختیار کیا، باوجود سید صاحب سے بیعت کر لینے کے ان کی فضیلت علمی اور مصلحت جہاد نے سید صاحب کا کلی طور پر اتباع نہیں کیا، اور اس کو اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ جہاد کو جاتے ہوئے مولوی عبدالحی کو اجمیر سے دہلی بھیج دیا گیا اور تمام تر ذمہ دار شاہ صاحب ہی بنا دیئے گئے۔

ضرورت ہے کہ سید صاحب کے حالات علیحدہ کر کے خالص سید صاحب کے رنگ میں دکھائے جائیں، سید صاحب صلح کل تھے، امن کے حامی تھے اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دے کر توحید کی لا اہتواء و بے پناہ وسعت کو چکانا چاہتے تھے، مگر اتنی مدت مدید کے بعد تاریکیوں میں سے ان کے درخشاں اصول کو علیحدہ کرنا بہت مشکل ہے، مگر ممکن ہے۔ عجائب پرستی نے ان کے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے، اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان تذکروں سے خرافات دور کر کے سید صاحب کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر ان کے حالات جمع کئے جائیں، تاکہ سید صاحب کی عظمت نمایاں ہو سکے، میں نے ان تذکروں کے خس و خاشاک کو چھانٹنے کی کوشش کی ہے، کوئی اہل ہمت جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے، سید صاحب کے گوہر گر انما یہ کو صاف صاف منظر عام پر پیش کر دے تو بعید نہیں۔

اس صاحبان نے فروعی مسائل میں اپنی جدتوں سے جو انقلاب پیدا کرنا چاہا، اس کی تردید علماء اہل سنت نے کی ہے اور جواب میں حدیث و قرآن سے استدلال کر کے بہترین مواد جمع کر دیا، لیکن نتیجہ نہیں نکلا، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ علماء اہل سنت فروعیات کا جواب دینے میں مبتلا ہو گئے، انہوں نے نہ سید صاحب کی حیثیت کو سمجھا اور نہ اس تعلیم پر غور کیا جو سید صاحب سے منسوب کی گئی ہے، سید صاحب کو گوشہ نشین ہونے کی وجہ سے ولی کہا جاسکتا ہے، ایسے لوگ اپنی جگہ بیٹھ کر ہدایت کیا کرتے ہیں اور منظر عام پر نہیں آیا کرتے، اگر کوئی بڑا اور ظاہری کام کرنا ہوتا ہے تو اپنے خلفاء اور مریدوں کے ذریعہ کروادیتے ہیں، یہ تعلیم جو سید صاحب سے منسوب کی ہے، شریعت اور طریقت دونوں سے مرکب ہے، مگر ان کے اصحاب تعلیم، طریقت کے اصولوں سے سطحی طور پر واقف تھے، لہذا علم معقول کے ذریعہ طریقت کی جو گت انہوں نے بنائی وہ بے تکی اور ناقص ہے، علمائے اہل سنت نے ان کے طریقت والے جز پر توجہ نہیں کی، اگر وہ اس کا بھی لحاظ رکھتے تو یقین ہے کہ خلیج پٹ جاتی اور افہام و تفہیم کی شکل نکل آتی، اصلاح کی خاطر یہ کام آج بھی کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ فریقین کٹ جتی اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں، اصلی مقصد چھوڑ کر فروعیات کی خاطر وحدت اسلامی کو خطرے میں ڈالنا مذہب اسلام کی توہین اور انسانیت کی تذلیل ہے، تقاضائے وقت طرح طرح سے شیر و شکر ہو جانے کی ہدایت کر رہا ہے، اب بھی اگر آیات الہی پر توجہ نہیں کی اور ذاتی خود مطلبی و اغراض پر قائم رہی تو نتیجہ معلوم، ڈوبنے والی کشتی ڈوبنے سے بچ نہیں سکتی۔

فاعتبروا یا اولی الأبصار۔

صبیر

وحید احمد مسعود قطبی صابری

شیخوپور۔ بدایوں

یکم جولائی ۱۹۶۵ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

## فاتحہ ثانی

ہم سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی  
 ”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“ پر یہ نظر ثانی رواداری میں بغیر یکسوئی، سکون و  
 قرار کے کی گئی ہے، یہ مضمون رسالہ منادی دہلی کے خاص نمبر بابت ستمبر ۱۹۶۵ء میں  
 چھپا تھا، پھر جولائی ۱۹۶۶ء میں مکتبہ مسعود، لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا، اور  
 اس کی جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں، مجھے مسرت ہے اور ممنون ہوں کہ یہ جسارت قدر  
 کی نگاہوں سے دیکھی گئی، اب اتنی جلد نظر ثانی کے لئے اصرار اس لئے ہے کہ بعض  
 اشارے تفصیل چاہتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ جہاد کے متعلق میری رائے واضح طور  
 پر نہیں سمجھی گئی اور میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ ابھی تک سید صاحب کے  
 معتقدین نے کوئی جواب نہیں لکھا ہے۔

میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مجھے بیت بازی منظور نہیں ہے اور اگر میری کسی  
 رائے سے اختلاف ہو اور وہ صحیح بھی ہو تو مجھے تسلیم کرنے میں کبھی تکلف نہ ہوگا، گزشتہ  
 مرتبہ اپنے خیال میں سید صاحب کے جہاد کے متعلق میں نے واضح بحث کی تھی، مگر  
 شاید میری بے بضاعتی کی وجہ سے میرا مفہوم واضح نہ ہوا، اس مرتبہ مزید تشریح کر رہا  
 ہوں، اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں معذور ہوں۔

جو اشارے محتاج تفصیل ہیں، ان کی بھی وضاحت حتی المقدور کر دی ہے،  
 ترمیم و تنسیخ کے علاوہ تین باب اور لکھے ہیں، جن سے عقائد اور ماحول کے متعلق کچھ  
 واقفیت حاصل ہوگی۔۔۔ والسلام مع الاکرام

بندہ محبت

وحید احمد مسعود

شیخوپورہ۔ بدایوں۔ یوپی۔ نومبر ۱۹۶۶ء



## ابتدائی حالات

رائے بریلی کا مشہور و معروف قطبی خاندان سادات کسی تعارف کا محتاج نہیں، شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، ان کی اولاد میں متعدد بزرگ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے، سید نعمان کے بھائی سید محمد عرفان زہد و تقویٰ میں مشہور تھے، ان ہی کے صاحبزادے جناب سید احمد تھے، یہ یکم ماہ محرم یا ماہ صفر ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء کو یہ عہد شاہ عالم ثانی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۵۹ء) میں پیدا ہوئے تھے، اور اسی سال لارڈ کارنوالس نے ہندوستان کی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی تھی، ان صاحبزادے میں عام بچوں کی سی باتیں نہیں تھیں، خصوصیت یہ تھی کہ من موجدی تھے، اپنی کہتے تھے اور جو کہتے تھے مختصر کہتے تھے اور خود ہی سمجھتے تھے، زبان صاف نہیں تھی اور آخر تک صاف نہیں ہوئی، مسکینی، غریبی، کم خنی اور آہستہ بات کرنا آپ کی خصوصیات تھیں۔ (حیات طیبہ)

ان کے بڑے بھانجے سید محمد علی ان سے عمر میں بڑے تھے، انہوں نے اپنی کتاب ”مخزن احمدی“ میں لکھا ہے کہ سید صاحب کی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی، تحصیل علم سے رغبت نہ تھی، ”حیات طیبہ“ کا بیان ہے کہ غیر معمولی سکوت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے غمی مشہور تھے، بچپن میں ہی نہیں بلکہ جوانی میں بھی پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت نہیں تھی، قرآن پاک ناظرہ پڑھا تھا، اس کی چند سورتیں یاد ہو گئی تھیں، کریمہ کا پہلا مصرع دعائیہ ہے، مگر یاد کر کے نہیں دیا، تین برس کی تعلیمی کوشش کے بعد ان کے والد سید محمد عرفان صاحب نے فرمایا:

”انہیں خدا پر چھوڑ دو، وہ ان کے حق میں جو بہتر سمجھے گا، کرے گا۔“

بہر حال ان صاحبزادے کی حرکات و سکنات سے بے رغبتی ظاہر تھی، انہیں  
 این و آں کی پرواہ نہیں تھی، لہذا ان کی غمخوردی پر داخت پر کسی نے توجہ نہیں کی اور انہیں ان  
 کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

تعلیم سے نجات پا کر ان کے دو مشغل تھے، قلم کے بجائے ڈنڈا ہاتھ میں لے  
 ہوئے گھومتے پھرنا اور ہمسایوں کے گھروں کا سودا سلف بازار سے لادینا، اس خدمت  
 گزاری نے انہیں بستی بھر کا محبوب بنا دیا تھا، وہ کسی کے ہنسنے کی پرواہ نہیں کرتے تھے  
 اور اچھی بری نظروں کو بھی نہیں پہچانتے تھے، انہیں محض اپنی دھن سے کام تھا، جیسا  
 پہننے کو مل جاتا پہن لیتے، جیسا کھانے کو دے دیا جاتا کھا لیتے، البتہ کلبھی کھانے کا شوق  
 تھا، جب سترہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو مشفق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس کے بعد  
 کچھ عرصہ جوں توں گزارا، آخر کار ترنگ جو اٹھی تو بغیر کسی کو خبر کئے اپنے سات عدد ہم  
 جولیوں کو ساتھ لے کر اصحاب کہف کی طرح چل دیئے، چلتے چلتے بجائے غار کے شہر  
 لکھنؤ پہنچ گئے، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا، وہاں کی معاشرت سے ناواقف تھے، وہ  
 شیعہ سی جھگڑوں کو نہیں جانتے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں سنیوں کو خارجی کہہ کر نفرت  
 سے دیکھا جاتا تھا، سابقہ پڑا تو کھو گئے، وہاں تسلیم و کورنش کو گوارا کر لیا، ازراہ ترحم  
 شریف اور سادہ سمجھ کر اگرچہ ان کی مدارت ہوئی، مگر دل ہی دل میں وحشت ہوئی اور  
 جی نہ لگا، چھ سات مہینے گزار کر ایک دن بے علم و اطلاع ساتھیوں کو چھوڑ کر لکھنؤ سے  
 جدھر سینگ سمایا چل پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ اس تنہائی و بے کسی کے سفر میں لوگوں نے ان کی کرامات کا  
 بھی مشاہدہ کیا اور ہر ایک نے اپنے یہاں ٹھہرانے کی کوشش کی مگر یہ رکنے والے نہیں  
 تھے، گردش روزگار نے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں چلتے چلاتے انہیں دہلی پہنچا دیا، دہلی پہنچ  
 کر انہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا خیال آیا، کیونکہ گھر والوں سے ان کا ذکر سنا تھا  
 لہذا پوچھتے پوچھتے شاہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے، شاہ صاحب ان کے خاندان سے

واقف تھے، ہاتھوں ہاتھ لیا اور شاہ عبدالقادر کے پاس اکبری مسجد بھیج دیا، ”مقالات سر سید“ جلد ۱۶، صفحہ ۲۲۵ پر مذکور ہے کہ سید صاحب پہلے شاہ عبدالقادر کے پاس پہنچے تھے اور انہوں نے تعلیم کے لئے بٹھال لیا تھا مگر تعلیم پر توجہ کرنے کے بجائے وہ ان درویشوں کی خدمت زیادہ کرتے تھے جو مسجد میں مقیم تھے، بعد میں شاہ عبدالعزیز نے ان پر توجہ فرمائی، اس زمانہ میں شاہ اسماعیل بھی مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے، لہذا کچھ دن سید صاحب نے شاہ اسماعیل سے بھی تعلیم پائی تھی، قیام دہلی میں جب شاہ صاحب کے خاندان میں آداب عرض کرنے کا رواج دیکھا تو اعتراض کر دیا کہ السلام علیکم کہنا چاہیے، یہاں جتنی بھی کتابیں پڑھی ہوں مگر حسب معمول نتیجہ صفر تھا، کہتے ہیں کہ کافیہ تک پڑھا تھا، اور یہ بھی مشہور ہے کہ مشکوٰۃ شریف کا بھی مطالعہ کیا تھا، مگر بے دلی و بے رغبتی کا حال معلوم کر کے شاہ عبدالعزیز نے انہیں اپنے پاس بلایا اور جائزہ لے کر یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ اس دنیا کے آدمی نہیں ہیں، اس کے بعد انہیں روحانی تعلیم دینے کے لئے مرید کیا اور مجاہدات کروانے کے لئے حجرے میں بٹھا دیا، قیام دہلی کی مدت ڈیڑھ سال بتائی جاتی ہے، مجاہدات سے انہیں فائدہ ہوا، اس خوش آئندہ تبدیلی کا باعث شاہ صاحب ہوئے، لہذا ان کے فیض صحبت سے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے:

اتنی سی بات تھی اسے افسانہ کر دیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## بیعت کا فسانہ

بیعت معمول کے مطابق لی گئی تھی، مگر اس کو اہمیت دے کر عجائبات کا ایک ڈھکوسلا بنا دیا ہے۔ اقرار ہے کہ طریقہ نقشبندیہ میں بیعت لی تھی، مگر تشریح غرابت کے ساتھ کی گئی ہے۔ لکھا گیا ہے کہ بیعت لیتے وقت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ:

”اگرچہ اس صاحب باطن کو رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج نہیں ہے، مگر اہل ظاہر کی رفع حجت کے لئے بیعت لئے لیتا ہوں۔“

شاہ صاحب کے طریقہ میں رشد و ہدایت کے لئے وسیلہ کی احتیاج لازمی ہے۔ اگر شاہ صاحب سمجھتے کہ وہ کامل ہیں تو بیعت لے کر فعل عبث نہ کرتے۔ مرید اقرار کیا کرتا ہے کہ مرشد کی فرمانبرداری کیا کروں گا، بیعت کے معنی ہیں:-

”دل بدستے دگرے دادن و حیران بودن“۔ بیعت ہو جانے کے بعد مرید کی کوئی مرضی نہیں رہتی اور چون و چرا کا اسے کوئی حق نہیں رہتا۔ بیعت صفائی باطن کے لئے لی جاتی ہے۔ بیعت کے وقت ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں سید صاحب کی عمر اکیس سال کی تھی، ظاہر کیا گیا ہے پہلے دن لطیفہ قلب کی تعلیم فرمائی گئی۔ دوسرے دن پانچوں لطیفے کھل گئے۔ تیسرے دن سلطان الاذکار کی منزل طے ہوئی۔ چوتھے جلسہ میں نفی و اثبات حاصل ہو گیا۔ پانچویں دن کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، غالباً چھٹی رہی ہوگی۔ چھٹے جلسہ میں طریق یادداشت پر عبور ہو گیا، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے محض اصطلاحیں جانتے تھے اور طریقت سے واقف نہ تھے ورنہ ایسی بے تکی روایت نہ کرتے۔ حضرت شیخ مجدد سرہندی قدس سرہ نے باوجود علم و فضل رکھنے کے یہ منازل ڈھائی مہینے میں طے کی تھیں، اس داستان کو سن کر یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحب کا ظرف نہایت درجہ عالی تھا، جو توجہ کو برداشت کر کے چھ دن میں یہ مرحلے طے کر گئے، ورنہ اتنی تیزی میں حواس ہی نہیں جان بھی جاتی رہتی ہے، جب شاہ



صاحب نے شغل برزخ یا تصور شیخ کے لئے کہا تو سید صاحب نے سادگی سے عرض کیا کہ یہ از قسم بت پرستی ہے، شاہ صاحب نے اس پر حافظ شیرازی کا شعر سنایا کہ ”بہ مئے سجادہ رنگین کن گرت پیرمغاں گوید“، یہ سن کر سید صاحب نے ادب کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا اور کہا اگرچہ مئے نوشی حرام ہے مگر میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، مگر خدا کے واسطے شغل برزخ سے مجھے معاف کر دیا جائے، ان کی فہم و فراست کو سمجھ کر، سید صاحب کو اپنی بغل میں لے کر ان کے رخسار اور پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے انہیں خوش خبری سنائی کہ اے فرزند ارجمند حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء تم کو مرحمت کی ہے۔ (۱)

بغل گیری اور بوسہ شبتی تو صحیح ہے مگر ولایتوں کے عطیہ کا ایک مبتدی سے ذکر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، بہ حیرتم کہ عجب تیرے کماں زدہ است، اب یہ صاحب باطن نابلد ہونے کا اقرار خود کر رہا ہے کہ براہ کرم بتا دیجئے کہ یہ ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کس چڑیا کا نام ہے۔

یا تو تصور شیخ سے وہ انکار یا یہ لاعلمی کہ ولایتوں کے معنی و فرق کو دریافت کرنا پڑا، لکنے والے شاید خود بیعت سے نابلد ہیں ورنہ ایسی بے سرو پا نہ اڑاتے، پاپھر ان امور سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ سید صاحب نے خود مرشد کی اصلاح کرنا چاہی تھی لیکن ایسی حجت بازی مدرسوں میں ہوتی ہے، خانقاہ میں نہیں ہوا کرتی، شاہ صاحب نے قال کا جواب حال سے دیا یعنی بغل میں لے کر رخسار و پیشانی کو بوسہ دیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنی روحانی قوت کا اثر ڈالا۔ یہ بوسہ شبتی بذات خود راز بستہ ہے جس کو ناواقف راہ طریقت نہیں سمجھ سکتے۔ مہر صاحب نے سید احمد شہید کے صفحہ ۷۷ کے نوٹ میں طریقت سے اپنی ناواقفیت کا اقرار کرتے ہوئے اپنا قیاس ظاہر کیا ہے کہ:-

۱۔ کتاب نور محمدی، مصنف نسیم احمد علوی مہنجانوی میں ہے کہ سید صاحب رائے بریلی سے حضرت شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ آپ کے خاندان میں تو منصب ولایت موروثی ہے، ان شاء اللہ آپ بھی اپنے آباء اجداد کی طرح رتبہ خصوصی پر فائز ہوں گے۔ (منقول از نقش حیات، ص: ۳۹) مسعود

”شاہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ دو اسید صاحب کے مزاج کے سازگار نہیں آ سکتی۔ کیونکہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور منزکی تھی کہ تصور شیخ کو قبول نہ کر سکی۔ لہذا اسے چھوڑ دیا۔ اور تصور شیخ کی ضرورت نہ سمجھی۔“

جس علم سے واقفیت نہ ہونے کا اقرار ہو۔ اس کے متعلق قیاس کرنا عقلمندی سے بعید ہے۔ ورنہ کہہ دیا جائے گا کہ ہذا بہتان عظیم۔ شیخ طبیعت کو پاک و منزکی بنانے کے لئے یہ تمام پاڑ بیللا کرتا ہے۔ اگر جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کے قیاس کو تسلیم کر لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے اصول سے شاہ ولی اللہ کی تعلیم سے حضرت مجدد سرہندی کے طریقہ سے اور چاروں سلاسل کے معمولات سے انحراف و اختلاف کر دیا، کیونکہ یہ سب تصور شیخ کے عامل و قائل ہیں، محمد عاشق پھلتی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر کی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور سید صاحب نے خود صراط مستقیم میں اس کو جائز لکھا ہے۔ اسی اصول پر مولوی مرتضیٰ کو سینہ سے لگا کر سید صاحب نے خود تسکین دی ہے اور میاں محمد حسین کا اقرار ہے کہ:

”جس وقت میں نے سید صاحب سے بیعت کی مجھ پر میرا وجود منکشف ہو گیا اور پھر دل میں نظر ڈالتا تھا تو سید صاحب ہی سید صاحب نظر آتے تھے۔“ (سیرت سید احمد شہید ص ۲۷۵)

مولوی رشید احمد گنگوہی ”ارواحِ ثلاثہ“ کے صفحہ ۲۹۰ پر رقمطراز ہیں کہ:-

”تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے کوئی کام نہیں کیا۔“

اس آخری فقرہ کے معنی یہ ہوئے کہ تصور بولتا تھا اور جواب دیتا تھا، تصور کو بت اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ تصور بول سکتا ہے۔ بہر حال مفہوم کچھ ہی ہو مگر بغل گیری اور بوسہ مہبتی کے بعد سید صاحب کو ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کا مژدہ سنایا گیا، معلوم نہیں یہ مبارک باد ہے یا پیشین گوئی ہے۔ استحکام محبت کے لئے تصور

ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کو شرک فی العلم سمجھنا سمجھ کی غلطی ہے۔ اس سے جملہ وساوس دفع ہو جاتے ہیں۔ اس کے کامل ہو جانے پر عالم ملکوت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ حدیث احسان تصور کے دو طریقے بتاتی ہے۔ یا یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یا یہ خیال جماؤ کہ تم اللہ جل شانہ کو دیکھ رہے ہو۔ پھر یہ تو واقعہ ہے کہ تصور شیخ کے متعلق تو اتر اجماع امت کی دلیل ہے۔ حضرت مجدد سرہندی، شاہ ولی اللہ، شیخ کلیم اللہ جہان آبادی۔ یہ سب تصور کے قائل ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:-

چوں خلیل آمد خیال یار من  
صورتش بت، معنی او بت شکن

اب بھی اگر دھاندلی، ضد اور ہٹ کی جاتی ہے تو اعلانیہ اقرار ہے:-

آرے آرے میکنم با خلق و واعظ کار نیست

بہت اچھا! تصور شیخ شرک ہی سہی، تو حدیث احسان کے دوسرے حصہ پر کہ نماز پڑھتے میں یہ سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے، عمل کیجئے اس عمل میں، التحیات اور درود شریف پڑھتے وقت رسول ﷺ کا خیال ضرور آئے گا، اگر اس کو ہٹانا چاہا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اس کو قائم رکھا تو شاہ اسماعیل کے مسلک سے خارج ہونا پڑے گا۔ فاعتبروا یا اولی الأبصار۔

یہ انکار تصور ہی اس نئے مسلک کی بنیاد ہے، جس کی تردید خود سید صاحب کے طرز عمل سے ہو جاتی ہے۔ پھر اس سنگ بنیاد کو ولایتوں کے فرق سے تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کی توجیہ و تشریح تقویۃ الایمان میں وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ مجاہدات کے ذریعہ ولایت اولیاء حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب سالک تکمیل کر لیتا ہے تو مخلوق کی تبلیغ کرنے کو متعین کیا جاتا ہے، اس خدمت تبلیغ کی اہلیت کو ولایت انبیاء کہا جاتا ہے۔ یہ مرتبہ جملہ ولایت سے افضل ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد ارشاد کیا گیا ہے کہ:-





دی ہے۔ سید صاحب کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کے مسلک کے خلافت شاہ عبدالعزیز صاحب کی زبان سے تائید کروائی گئی ہے، اندھیر ہے۔۔۔۔۔ یہ شیطان کی پھونکی ہوئی کرامت ہے۔۔۔۔۔

بیشک حدیث و قرآن کی تعلیم سے ایمان پختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجاہدے کئے جاتے ہیں۔ قدیمی اور عام طریقہ یہی ہے کہ مجاہدات کو ولایت عامہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ولایت خاصہ کی دو قسمیں ہیں۔ ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء، ولایت اولیاء کو ہمیشہ سے تقدم حاصل ہے۔ بیشک شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا مقصد محبت الہی ہے۔ اور محبت کے بھی کئی اقسام ہیں۔ حب عقلی اپنے فائدہ کے مد نظر کڑوی دوا کو گوارا کر لیتی ہے۔ حب ایمانی کا نام شریعت ہے۔ اور یہ بالکل اختیاری ہے۔ چونکہ اختیاری ہے اسی لئے اس پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ یہی حب ایمانی ترقی کر کے حب عشقی بن جاتی ہے۔ اشد حب اللہ کی آیت کریمہ اسی حب عشقی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ حب ایمانی گویا حب عشقی کا مقدمہ ہے۔ حب عشقی میں نہ اختیار ہے نہ ارادہ۔ لہذا اب یوں سمجھنا چاہیے کہ حب ایمانی کے دو درجے ہیں۔ یعنی ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء، ولایت اولیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بحت کی تجلی صفات کے پردے میں ہوتی ہے۔ جہاد نفس اس کے لئے لازمی ہے اور تصور شیخ کی اسی منزل میں ضرورت ہوتی ہے اور اسی کو جہاد اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ولایت انبیاء میں تجلی کا ظہور بلا واسطہ ہوا کرتا ہے۔ اس درجہ کا جہاد، جہاد اصغر ہے۔ یہی منزل فنا فی اللہ کی ہے۔ صاحب ولایت انبیاء کا مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ خود اس کا ہاتھ۔ کان اور زبان بن جاتا ہے۔ اور گفتہ او گفتہ اللہ بود۔ اندریں صورت کون ہے جو قدم اول پر ہی بلا واسطہ تجلی کو برداشت کر سکے۔ اور اگر کر سکتا ہے۔ تو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں یا ہوش و حواس کھو کر مجذوب مطلق بن کر رہ جاتا ہے۔ اب تجد نواز بمشورہ ابلیس جو کچھ بھی تاویل کریں ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ مگر ان کا یہ کہنا ہے





معمولی سے قطرہ آب کے اندر مقید کر کے دکھایا ہے۔۔۔۔۔ پہلے ہی قدم پر ان کو نہ صرف ولایت انبیاء سے مزین کر دیا ہے۔ بلکہ امام، معصوم اور مامور بھی مشہور کر دیا ہے، اور مہدی بھی بنا دیا ہے۔ (۱) وہ جو کچھ بھی بنائیں مگر مادر زاد ولی کو رسمی علوم کے مباحث سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ اس کا ذریعہ معلومات علم معقول سے علیحدہ ہوا کرتا ہے وہ مدرسہ والوں کی خوب نہیں رکھتا۔ وہ اپنی روحانیت کے سامنے ان وایات فروغی مسائل پر توجہ نہیں کیا کرتا۔

اعتراض سے بچنے کے لئے خواہ مخواہ سید صاحب کو ظاہری تعلیم سے مزین کرنے کی بھی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اور جب اطمینان نہیں ہوا تو باطل پرستی کی آڑ لے کر شہرت دے دی کہ نعوذ باللہ من ذلک، سید صاحب حضور نبی کریم ﷺ کی مشابہت پر مخلوق کئے گئے تھے۔ اسی سبب سے بے علم رہے۔ اسی لئے انہیں ”امی“ سے ملقب اور علم لدنی سے متصف کیا گیا۔ پھر اسی بنیاد پر نبوت سے ملا کر ان کے مرتبہ کو نبوت کے برابر ظاہر کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ رسول ہاشمی صلو علیہ وآلہ کا امی ہونا بے مثال معجزہ ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اسماعیلیہ اپنی موصدیت کے باوجود عجائب پرستی و تشبیہ کی تقلید کیسے کرنے لگے، معتقدین نہیں سمجھتے کہ جناب سید احمد صاحب سے روز حشر ان خطابات و کرامات کے متعلق جب پرسش ہوگی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ صاف فرمادیں گے کہ میں ان پرستاروں سے بری ہوں اور ان ہذیانوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز  
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۔ ملاحظہ ہو نواب صدیق حسن کی ”اربعین“ اور ولایت علی صادق پوری کا رسالہ تسعہ اور جعفر تھامیری کی برکات اسلام۔



## بیعت کے بعد

سید صاحب کا دہلی میں قیام تقریباً ڈیڑھ سال رہا۔ کچھ دن ظاہری تعلیم میں صرف ہوئے۔ کچھ دن مجاہدے کئے اور کچھ دن شاہ عبدالعزیز کی صحبت میں رہے۔ گوشہ نشینی کی زندگی خاموش زندگی تھی۔ مدرسہ والوں سے رسم و راہ پیدا نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ شاہ اسماعیل بھی اپنے اس شاگرد کو ناقابل توجہ سمجھے۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء کے آخر میں سید صاحب وطن مالوف تشریف لے گئے۔ یہ وہ سال ہے جب کہ روسی حملہ کی خبر سن کر تیموری شاہزادہ زمان شاہ لدھیانہ سے کابل گیا ہے اور اسی سال زمان شاہ کے گورنر نجیت سنگھ نے کشمیر ملتان اور پشاور پر تسلط جما کر پنجاب میں سکھ حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔ وطن والوں نے جوش و مسرت سے سید صاحب کو خوش آمدید کہا۔ مسرت اس بات کی تھی کہ ان کا لالہ ابالی پن سنجیدگی سے بدل گیا تھا اور ان کے حرکات و سکنات سے تہذیب و اخلاق ظاہر ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف خود پابند شریعت ہو گئے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی پابند شرع بننے کی نصیحت کیا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی محویت کی ایک جھلک ان میں دکھائی دیتی تھی۔ اہل خاندان نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ان کے گلے میں سنت پیغمبری کا طوق ڈال دیا کہ گریز پائی کا علاج ہو جائے۔ اور گھر کی رونق میں اضافہ ہو۔ ان کی ازدواجی زندگی حوالہ قلم نہ کر کے ان کے سوانح نگاروں نے اپنی کم نظری و کوتاہ بینی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ البتہ سوانح احمدی میں اس قدر بتایا گیا ہے کہ ان دو برس کے ایام میں ایک صاحبزادی تولد ہوئی تھیں جن کے بطن سے ایک صاحبزادے اسماعیل پیدا ہوئے اور سید صاحب کے اصل واقعات کو نظر انداز کر کے عجائب پرستی

کے ڈھکوسلوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً سید صاحب کو رسول مقبول ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی جسمی زیارت کی خواب میں سعادت حاصل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے خواب میں تین چھوڑے اپنے دست مبارک سے ان کے منہ میں رکھے۔ حضرت سید کرم اللہ وجہہ نے اپنے ہاتھ سے انہیں غسل دیا اور سید تاجی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خود اپنے دست مبارک سے انہیں کپڑے پہنائے۔ حضرت غوث الثقلین اور خواجہ نقشبند میں ایک مہینہ تک برابر کشمکش ہوتی رہی کہ کون ان کو اپنی طرف جذب کرے، اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ دونوں ایک ساتھ اپنی روحانیت سے انہیں مستفیض فرمائیں۔ اس سے پہلے قیام دہلی کے زمانہ میں کبھی سید صاحب نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار مبارک پر اعتکاف کیا تھا تو ان کی روح پاک نے بہ حکم رب خود بخود نسبت چشتیہ عطا کر دی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان خوابوں کی اصلیت کیا ہے، مگر ان کے اظہار سے واقفان رموز خوش نہیں ہوتے، مگر ان امور سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ سید صاحب کی طرح ان کے معتقدین ان مقدس ہستیوں کے وصال کے بعد بھی ان کی فیض رسانی کے قائل ہیں۔ استغاثہ سے منحرف نہیں ہیں اور عالم برزخ کی حیات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو شخص ان حقائق کو نہیں مانتا وہ سید صاحب کی جماعت سے یقیناً خارج ہے۔ یہ خواب کچھ ہی ہوں مگر ان سے سید صاحب کے اعزاز و منزلت کا اظہار مقصود ہے۔ بہر حال وطن کے اس قیام میں ان کی وجدانیت میں ان کا اضطراب محسوس کیا جاسکتا ہے اور اعزاء و اقارب کو اسی سے اندیشہ تھا، چنانچہ دو برس کے صبر و سکون سے وہ اکتائے اور ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۹ء میں جب کہ انگریزوں اور رنجیت سنگھ سے معاہدہ ہوا تھا، وطن سے ایسے گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سید صاحب پنڈاریوں میں

مالوے کے لٹیرے پنڈاری کہے جاتے تھے، یہ درندگی اور خونخواری میں ید طولی رکھتے تھے اور امن کے جانی دشمن تھے، بستیوں میں آگ لگانا، کھیتوں کو اجاڑ دینا اور لوٹ مار کر کے رنو چکر ہو جانا، ان کا وطیرہ تھا، گھوڑوں پر بیس پچیس کوس تک دھاوا مار لیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ دو یا تین عورتوں یا لڑکیوں کو لادھ کر لے جاتے تھے اور فروخت کر دیتے تھے، ان کا کوف اس درجہ طاری تھا کہ ان کی خبر سنتے ہیں مرد اور عورت کنوؤں میں چھلانگ مار کر جان دے دیا کرتے تھے، مالوے کے راجہ ان سے مدد لیا کرتے تھے اور اپنے یہاں ملازم بھی رکھتے تھے، یہ پنڈاری کالی دیوی کو پوجتے تھے، اپنی لوٹ مار میں اس سے شگون لیا کرتے تھے، دسہرہ کا تہوار دھوم دھام سے مناتے تھے، اسی دن نئی بھرتی کی جاتی تھی، سال بھر کا پروگرام بنایا جاتا تھا اور افسروں کو ترقی دی جاتی تھی، ان کے سردار چیتو، واصل خان، کریم خان اور امیر خان تھے۔

امیر خان سنہل (ضلع مراد آباد۔ یوپی) کے رہنے والے تھے، بچپن میں عسرت کی وجہ سے بھینسیں چرایا کرتے تھے، جب پچیس سال کے ہوئے تو کسی طرح پنڈاریوں میں شامل ہو گئے، ان کے یہاں رفتہ رفتہ ایسے ایسے نمایاں کام کئے کہ سب نے انہیں افسر اعلیٰ تسلیم کر لیا، امیر خان کے راجہ ہلکر سے گہرے تعلقات تھے، راجہ انہیں نواب کہا کرتا تھا، ان کی دیکھا دیکھی پنڈاریوں کا ہر افسر اپنے آپ کو نواب کہنے لگے۔

راجہ ہلکر کی رانیوں میں سب سے زیادہ حسین تلسی بانی تھی، راجہ کے مرجانے کے بعد وہی قارٹ تخت اور نابالغ صاحبزادی کی ولی بنی، اس کا دل امیر خان سے مل گیا تھا، لہذا اپنے ساتھ ان کو بھی ولی نبالیا تھا، اس طرح امیر خان کی شان میں اور بھی

چار چاند لگ گئے، اسی جلن میں تلسی بانی کو کسی پنڈاری نے ۱۸۱۸ء میں قتل کر دیا تھا (۱)۔  
 تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سید صاحب وطن سے فرار ہو کر ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں پنڈاریوں کے جتھے میں نمودار ہوئے، پتہ نہیں کہ مالوہ جانے کا انہیں البام ہوا تھا۔  
 شاہ عبدالعزیز نے ہدایت کی تھی یا بھائی سے ملنے کا ذاتی شوق اس کا محرک تھا، ان کے  
 بھائی کا نام کسی نے عبدالرحمن لکھا ہے اور کسی نے ابراہیم بتایا ہے، سید صاحب کے  
 پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا، سید صاحب کا قیام ان لوٹیروں میں  
 سات سال رہا، اس کے دو سبب بتائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ان بدتماشوں کی اصلاح  
 منظور تھی، دوسرے یہ کہ ان بلائے درمانوں سے فوجی تعلیم حاصل کرنا تھی، واقعات  
 مظہر ہیں کہ دونوں وجوہات میں سے کسی ایک میں بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے، البتہ  
 ان لوگوں سے سیکھ کر شب خون مارنے میں کمال حاصل کر لیا تھا، جس کی حدیث  
 ممانعت کرتی ہے، یعنی یہ کہ غفلت میں یا سوتے میں دشمن پر حملہ نہیں کرنا چاہیے، نواب  
 امیر خارا کے یہاں کسی کی تنخواہ مقرر نہیں تھی، مال غنیمت مل جاتا تو عید ہو جاتی ورنہ محرم  
 کا مہینہ رہتا، سید صاحب حسب عادت لشکریوں کی خدمت کیا کرتے تھے، ان کے  
 لئے دعا فرماتے تھے، ان کے ضمیر کا حال بتا دیتے تھے، برکت کے لئے یہ لوگ انہیں  
 مہموں میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ سید صاحب کو نجوم آتا ہے،  
 بعض کی رائے تھی کہ ان کے قبضے میں ہمزاد ہے، ان کے بھائی سے معلوم ہو گیا تھا کہ  
 سید صاحب پڑھے لکھے نہیں ہیں، مگر دہلی کے ایک سپاہی نے بتایا کہ شاہ عبدالعزیز  
 نے ان پر نظر ڈال دی ہے اور وہ ان ہی کے موٹے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ دوران  
 جنگ میں مخالف انگریز کے خیمہ میں بے درنگ داخل ہو گئے، انگریز افسران کے  
 والہانہ انداز دیکھ کر مشکوک نہیں ہوا بلکہ محظوظ ہوا، سوانح احمدی میں جعفر تھانیسری کی  
 روایت ہے کہ اس انگریز سے سید صاحب نے نواب امیر خان کی سفارش کی تو اس نے

امیر ج آف ہسٹری آف انڈیا، مرتبہ کلارک مارش مین سی ایس آئی، باب: ۱۰، ص: ۳۲۶

وعدہ کر لیا کہ وہ نواب سے نہیں لڑے گا اور انگریزی سرکار سے صلح بھی کرادے گا، اسی وجہ سے سید صاحب انگریزوں کے معترف و مداح تھے، سید صاحب بے کہے سے نواب امیر خان کی محفل خاص میں بھی پہنچ جاتے تھے اور ترقی و بہبود کی دعائیں دیا کرتے تھے، ایک روایت ہے کہ جب میجر اکلر لونی ۱۸۱۸ء میں دہلی کارپوریشن مقرر ہوا تو سید صاحب یہ سن کر کہ میجر اکلر لونی صلح کی گفتگو کرنے نواب امیر خان کے پاس آ رہا ہے، آدھی رات سے اٹھ کر نواب امیر خان کی خدمت میں پہنچے اور سمجھایا کہ انگریز سے صلح نہ کرنا، مگر نواب امیر خان کا عذر تھا کہ لشکر کا سامان درست نہیں ہے، لشکری بھی بد دل ہو گئے ہیں، لہذا مصلحت یہی ہے کہ صلح کر کے انگریزوں سے دس پانچ ہزار روپیہ لے لوں، اس کے بعد ان کی خبر لوں گا، سید صاحب نے فرمایا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا (واقع)، وزیر الدولہ نے واقع میں یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب پہلی مرتبہ جس روز لشکر میں تشریف لائے تو اعلان کیا کہ امیر خان کو ریاست و نوابی ملے گی، پھر کچھ عرصہ بعد ان کی ریاست سے مجاہدین کا لشکر لے کر ہم گزریں گے۔ مرزا حیرت اپنی کتاب ”حیات طیبہ“ میں رقمطراز ہیں کہ بیچ میدان جنگ میں خیمہ نصب کیا گیا تھا، اس میں سید صاحب، لارڈ ہیسنگز اور امیر خان کے درمیان گفتگو ہوئی تھی، نواب امیر خان صلح کے لئے تیار نہیں تھے، سید صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں شیشے میں اتارا کہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کی خاطر صلح کر لینا چاہئے، چنانچہ لارڈ ہیسنگز اسی وجہ سے سید صاحب کی تعظیم و توقیر کیا کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جملہ تذکرہ نگاروں کی روایتیں بر بنائے عقیدت فرضی و قیاسی ہیں، صاحب ”سیرت سید احمد شہید“ نے خرافات سے بچ کر کمالات کا اظہار مختصر و مبہم کیا ہے، سوانح احمدی میں کرامتوں کی بھرمار ہے، مولانا غلام رسول مہر صاحب نے اپنی تاویلوں سے کرامتوں کو قابل قبول بنا دیا ہے، جس کام منشا یہی ہے کہ منم کردہ ام رستم داستان، بہر حال سید صاحب کی مالوہ والی زندگی کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔



ہونے والی بات کہ لارڈ ہیسٹنگز نے نیپال کی جنگ میں کامیابی حاصل کر کے ایک بہت بڑی فوج سے مالوہ کا محاصرہ کر لیا، جب مرہٹوں اور راجاؤں نے ہتھیار ڈال دیئے تو امیر خان کے سامنے موت تھی یا صلح۔ سید صاحب کی ولایت و کرامت جب کچھ نہ بنا سکی تو نواب امیر خان نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ یہ صلح ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی جس کی بنا پر امیر خان کو وہ علاقہ دیا گیا جو ان کی جولانگاہ تھا یعنی ٹونک اور باقاعدہ نواب بنا دیا گیا، واصل خان کا انتقال ہو گیا، چیتو نے راہ فرار اختیار کی، جنگل میں اسے چھپتے نے ہڑپ کر لیا، کریم خاں کو گورکھپور میں جاگیر دی گئی اور نوابی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

سید صاحب پنڈاریوں میں سات سال رونق افروز رہے مگر حیرت ہے کہ ان کے متعلق خاندان والوں نے یا دہلی کے احباب نے تجسس نہیں کیا اور نہ سید صاحب کو اپنی اہلیہ اور صاحبزادی اور نواسی کی یاد آئی، البتہ مرزا حیرت نے اشارہ کیا ہے کہ سید صاحب لشکر سے چندہ جمع کر کے مدرسہ رحیمیہ کو دہلی بھیجا کرتے تھے، ایک رسالہ ”مکاتیب بریلی“ کے نام سے بھی شائع کیا گیا تھا، اس میں وہ خطوط تھے جو سید صاحب نے اپنی ازواج کو لکھے تھے، ان خطوط سے سید صاحب کی خانگی زندگی کے مستند حالات معلوم ہو سکتے تھے لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب اور مولوی سید ابوالحسن ندوی صاحب نے اس رسالہ کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے کہ درگفتن نہ می آید، بہر حال کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

جب انگریزوں سے صلح ہو گئی تو سید صاحب کا مالوے میں رہنے کا کوئی مصرف نہیں رہا، چنانچہ انہوں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ یہاں کا کارخانہ خراب ہو گیا ہے، لہذا میں آپ کی خدمت کے لئے واپس آ رہا ہوں۔

☆☆☆☆:☆☆☆☆☆☆

## مذہبی انقلاب

زاہد ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد

ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

شام و سحر کی دونوں شفقتوں کے درمیان کی تاریکی چھٹ گئی تو پوپھوٹتے ہی معلوم ہوا کہ مغلوں کی شہنشاہیت کا ستارہ ڈوب گیا اور انگریزوں کی قسمت جاگ اٹھی تحریک ولی اللہی کو شاہ عبدالعزیز خوبی سے چلا رہے تھے کہ اتنے میں شاہ اسماعیل نے سید احمد رائے بریلوی کی سرکردگی میں اپنی جوہت طبع سے نئی راہ نکالی، اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف میں کچھ ایسی ہوا چلی تھی کہ دنیا کے ہر حصہ میں اصلاحات و ایجادات ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔

ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے۔ اقتصادی بحران انقلاب کا باعث ہوا۔ یورپ میں اس کے دفعیہ کے لئے سائنس نیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضعیف البیان انسان خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس جدوجہد میں انگلستان کو تمام یورپ پر سبقت و فوقیت حاصل ہوئی۔ فیکٹری سسٹم کی ایجاد اور دولت کی افراط نے تہذیب و تمدن میں چار چاند لگا دیئے۔

فرانس اپنی فوجی قوت سے غیر منتظم یورپ کی ریاستوں پر اپنا سکہ جمارہا تھا، مگر اب اس کی فوجیں ملک ملک مساوات آزادی اور اخوت کا جھنڈا لے کر جانے لگیں اور انہوں نے یورپ کے پرانے آئین اور محدود اصولوں کو حرف غلط کی طرح مٹانا شروع کیا، نیولین نے نہ صرف یورپ سے اپنا کلمہ پڑھوایا بلکہ انگلینڈ کا بھی اپنے

سامنے سر جھکانے کی کوشش کی۔ اس کی کامیابیوں کا شور تمام ایشیا میں پھیل گیا۔ ان انقلابات سے مفلسی، آمریت اور محکومیت کے تخیلات کے بجائے قومیت و آزادی پر وان چڑھنے لگی۔ یورپ میں والٹیر۔ روسو۔ کانٹ اور دیگر مصنفین نے تصورات، جذبات اور اخلاق میں نئی روح پھونک دی۔ ورڈ سورتھ شاعر ایڈیم اسمتھ، بر اقتصادیات اور فلاسفر بیلٹھم نے ان رجحانات کو قبول کر کے گزشتہ موجودہ اور مستقبل کے لحاظ سے علمی و فنی حکمت، اخلاقیات اور کمالیت کے سبق دے کر قومی زندگی کی اصلاح کی۔ برک قدیمی وضع اور رسم و رواج کا حامی تھا۔ مگر اس کے ساتھ بیلٹھم فراخ دلی کی تعلیم دے کر بنی نوع انسان کو بے پایاں مسرت کے حصول کی تلقین کر رہا تھا۔ برک نے دستور قدیم کی حمایت کی اور بیلٹھم نے ترقی پسندوں کی جماعت بنائی۔ انگلستان والوں نے دونوں کو سراہا اور دونوں سے استفادہ کیا۔ ان فلسفیانہ تحریکات کا اثر مذہب پر پڑنا لازمی تھا، لہذا مذہبی جماعتوں میں تحقیق و تجدید کا جذبہ ابھرا، عبد بنود کے مذہب پرست چرچ کے قائل تھے، مگر اس کو من جانب اللہ نہیں مانتے تھے، اور ہر قسم کی برائیوں کے عادی تھے۔ لہذا ان پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ ویلزلی اور ویک فیلڈ نے ان تمام خرابیوں کے دور کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اور ان کی تحریک "میتھو ڈزم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ دونوں نے اپنی جوشیلی تقریروں اور وعظوں سے زہد و تقویٰ کی اشاعت کی ترک دنیا کی مذمت کی۔ ضمیر کی صفائی اور روحانی پاکیزگی کی تعلیم دے کر گناہوں کے کفارے اور تقدس کا سبق پڑھایا۔ ان کو دیہات و قصبات میں مقبولیت حاصل ہوئی، اس تحریک کے مؤرخ کا بیان ہے کہ اگر میتھو ڈزم یا اسی قسم کی کوئی تحریک وجود میں نہ آتی تو انگلستان قعر مذلت سے کبھی نہ نکل سکتا۔

میتھو ڈزم کے ہمعصر "ایونجیلکوز چرچ کے مؤید تھے، اور ان کی جماعت بہترین طریقہ سے منظم و متحد تھی۔ یہ لوگ چرچ کی دوسری جماعتوں کے برخلاف اپنے مخالفین پر تشدد کو جائز سمجھتے تھے۔ ان کا اثر اونچے اور درمیانی طبقات پر بہت تھا۔ اسی لئے عوام ان سے خائف تھے۔ ان میں کی ایک جماعت "کلیپہم" کہلاتی تھی۔ رسم غلامی کا دشمن ولبر فورس اور مشہور شاعر کوپرا اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، ان کے

اصول کے مطابق ہر انسانی مفاد کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور دنیا کا ہر مذہب ان کا نمائندہ بنایا جاسکتا ہے۔ (۱)

مدعا یہ کہ انقلابات و تنازعات مغربی ممالک میں ترقی کا باعث ہوئے، مگر مشرق میں ان سے ترقی معکوس ہوئی، یہاں اقتصادیات اور نظام حکومت کی خرابیوں نے پینے نہیں دیا، ہدایت و اصلاح کا کام علماء کے فرائض میں تھا مگر علماء نفسانیت میں مبتلا تھے اور سیاست و حالات زمانہ سے نابلد تھے، ان کی توجہ عقائد کی ادھیڑ بن اور مسائل کی کاٹ پھانس میں ہی مرتکز رہی، امام ابن تیمیہ نے اصلاح کی، انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی تھی، وہ نہایت قابل تھیں، ان ہی کے نام سے خاندان مشہور ہوا، امام ابن تیمیہ، حضور غوث پاک ﷺ کے سو سال بعد حران میں پیدا ہوئے، ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے، قلم سے اور تلوار سے جہاد کیا، ان کے زبان و قلم نے دوست کم بنائے اور دشمن زیادہ، چنانچہ انہی قیل و قال کی وجہ سے متعدد مرتبہ انہیں قید و بند سے سابقہ پڑا، مسلمان بادشاہ تاتاری غازن خان ان کا ادب کرتا تھا، مگر جب غازن خان نے مصر پر حملہ کیا تو ابن تیمیہ کی شمشیر آبدار نے جو ہر دکھائے اور غازن خان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

امام ابن تیمیہ کے اجتہادات کچھ اس قسم کے ہیں:-

۱۔ قرون اولیٰ کے طرز و تقلید میں اشاعت اسلام ہونی چاہیے، ان کے عقائد اگرچہ حنبلی تھے مگر آزاد قسم کے تھے۔

۲۔ ائمہ اربعہ کے اجتہاد کے قائل نہیں تھے، تقلید شخصی کے مخالف ہونے کے باوجود عوام کو تقلید کی اجازت دی تھی۔

۳۔ قرآن شریف کے لفظی و ظاہری معنوں سے استدلال کرتے تھے اور تاویل کو غلط سمجھتے تھے۔

۴۔ باری تعالیٰ کی تجسیم کے قائل تھے، فلسفہ دانوں کے اعتراضوں کو غلط سمجھتے۔

۱۔ ماخوذ از ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا مصنفہ تارا چند، ص: ۳۱۰-۳۱۲

۵۔ قرون اولیٰ کی تقلید کی وجہ سے ہر نئی بات ان کے نزدیک بدعت تھی، عقائد و معاشرے میں نئی باتوں کو روا نہیں رکھتے تھے۔

۶۔ زیارت قبور کے مخالف تھے حتیٰ کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار اقدس کی زیارت کو بھی گناہ خیال کرتے تھے، جب ”شدر حال“ کی حدیث سنی تو یہ ترمیم کر دی کہ زیارت قبور کی وجہ سے سواری وغیرہ کا انتظام کرنا درست نہیں ہے، ویسے جائز ہے۔

۷۔ جناب رسول کریم ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں مگر ان کے وصال کے بعد ان کی شفاعت کو تسلیم نہیں کرتے البتہ یہ تسلیم ہے کہ قیامت میں انہیں حق شفاعت مل جائے گا، حیات بعد الموت کے منکر ہونے کی وجہ سے مردوں کو نذا کرنے کو گناہ سمجھتے تھے، کیونکہ نذاذی روح کو دی جاتی ہے۔

۸۔ وسیلہ سے انہیں انکار ہے۔

۹۔ تصوف کے قائل ہیں، صوفیہ متقدمین کو سادات مومنین اور اختیار المسلمین میں شمار کیا ہے، مگر صوفیہ متاخرین پر اعتراض ہے، اس لئے کہ انہوں نے عقلیت و تاویل سے کام لیا ہے، زہد و تقویٰ میں غلو کیا ہے، وحدت الوجود، سماع اور خلوت کے اضافے کر لئے ہیں، ان کے خیال میں خلوت سے معرفت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عقل و سمع سے ہوتی ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ولایت طاعات سے ملا کرتی ہے، ابدال وغیرہ کے وجود کو نہیں مانتے، عبادت شرعیہ اور عبادت بدعیہ کی تشریح کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ مراقبہ وغیرہ غیر شرعی ہیں۔

۱۰۔ صوفیہ خام اور علماء سوء کی دھجیاں اڑائی ہیں، رفاعیہ فرقے سے دو بدو اور دست بدست مقابلہ کیا، فتنہ عقائد کی اصلاح کر کے عقلیت کی تردید کی، ۳ تاریخوں اور شیعوں سے جہاد کرنا ضروری بتایا، ان کی تصانیف و تقاریر میں جدت اور انفرادیت پائی جاتی ہے، عقلی و منطقی دلائل، مناظروں اور مباحثوں



میں بے تکان استعمال کئے ہیں، جناب رسول اللہ ﷺ کی قبر مطہر کی زیارت کے متعلق بحث کرنے کو علماء دمشق نے اپنا نمائندہ شیخ صفی الدین ہندی کو بنایا تھا۔ خاتمہ بحث پر ہندی مولوی نے اعلان کیا کہ اے ابن تیمیہ تمہاری مثال پھدکنے والی چڑیا کی سی ہے، جب تمہاری گرفت کرنا ہوں تو اچھل کر دوسری شاخ پر چلے جاتے ہو، معتقدین نے اس کے یہ معنی لئے کہ شیخ صفی الدین ہندی نے اپنی شکست مان لی کہ وہ ابن تیمیہ کی گرفت نہیں کر پائے، امام ابن تیمیہ چاہتے تھے کہ اپنے عہد کی سیاست کی اصلاح کریں مگر وہ سیاست کا دین سے رشتہ نہ ملا سکے اور ان کا اجتہاد کامیاب نہ ہو سکا، وہ ۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

## ابن عبد الوہاب

ابن تیمیہ کے بعد اپنے زمانہ میں ابن عبد الوہاب نجدی نے اعلان کیا کہ میں نیا دین لے کر آیا ہوں، پھر اپنے عقائد کے مطابق مقامات مقدسہ پر فوج کشی کی، طائف، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کربلا کے تقریباً تمام قبے اور مشاہد منہدم کر دیئے، روضہ نبی کریم ﷺ کے متعلق کہا کہ ”ہذا صنم اکبر“ لیکن کسی طرح اس کو نقصان نہیں پہنچا سکا، اپنی کتاب توحید میں لکھا ہے کہ ”اگلے کافرات، عزئی اور سواع کو پوجتے تھے اور اب یہ پچھلے کافر محمد، علی اور عبد القادر کو پوجتے ہیں، لہذا یہ اور وہ سب برابر ہیں، اس نے حضرت نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخانہ خیالات گندے الفاظ میں بدتمیزی کے ساتھ ظاہر کئے، مشرک چونکہ واجب القتل ہوتے ہیں، اس لئے ان کلمہ گو یوں کو جو اس کے عقائد کے نہیں ہیں، مشرک قرار دے کر ان کے قتل میں دریغ نہیں کی، اس کے عقائد یہ ہیں:-

۱۔ علماء وائمہ کے اقوال کو مہمل سمجھتا ہے، تقلید شخصی کو غلط کہتا ہے۔

۲۔ اس کے نزدیک قرآن و حدیث کا مطلب جو بظاہر سمجھ میں آئے وہی قابل

عمل ہے۔

۳۔ اس کی تعلیم عقلیت اور یونانی علوم سے مختلف ہے۔

۴۔ تصوف اور اصلاحات تصوف کا اس کے یہاں دخل نہیں۔

۵۔ حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کا ادعا کرتا ہے مگر اپنے اجتہاد کو ان کی رائے سے بہتر سمجھتا ہے۔

۵۔ توحید کا قائل ہے، صفات الہی کو تسلیم کرتا ہے، مگر تشبیہ، تجسیم اور تاویل کی نفی کرتا ہے۔

۷۔ غیر اللہ سے استغاثہ و توسل کو شرک خیال کرتا ہے۔

۸۔ جناب رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وسیلہ نہیں مانتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور

آنحضرت ﷺ کی دعا و شفاعت کے متعلق اس کا مقولہ ہے کہ ان کو حیات میں یہ حق حاصل تھا، عالم برزخ کی حیات سے انکار ہے اور کہتا ہے کہ ہماری یہ لکڑی بہتر ہے، اس لئے کہ وہ ہمارے کام آتی ہے مگر وہ وفات پاگئے، ان سے کوئی نفع نہیں رہا، وہ ڈاکیہ جیسے تھے، لہذا گزر گئے، قیامت میں البتہ انہیں حق شفاعت پھر مل جائے گا، جناب رسول پاک ﷺ کے وسیلہ کو ذات رسول ﷺ سے علیحدہ کر کے تسلیم کرتا ہے، انبیاء صالحین کی ذات کے واسطے کو ناجائز سمجھتا ہے۔

۹۔ قبروں پر سلام جائز ہے لیکن درخواست دعا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے، زیارت قبور مشروع ہے بشرطیکہ تجاوز نہ کیا جائے۔

۱۰۔ منکر کو مٹانے کی وجہ سے وہ قبروں کو منہدم کرتا ہے۔

۱۱۔ اس کے نزدیک اسماء صفات کے علاوہ کسی مخلوق کی پناہ لینا شرک ہے اور غیر اللہ کی قسم کھانا خلاف توحید ہے۔

ابن عبد الوہاب سلف صالحین کی پابندی کو صحیح سمجھتا ہے، اپنے مخالفین کو مرتد و کافر خیال کرتا ہے، لہذا ان پر تشدد کرنا جائز ہے، ان ہی اصولوں کی وجہ سے وہ عام

طور پر اہل قبلہ کی تکفیر کرنے کے سبب ملزم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر وہ جواب میں عمومی تکفیر سے انکار کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اتمام حجت و تبلیغ کی وجہ سے مکمل تکفیر و قتال کا روادار ہے، قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو عملی کفر کہتا ہے، مگر علماء اسلام کفر عمل اور کفر اعتقاد میں امتیاز کرتے ہیں۔ یہ وہابی توحید ربوبیت کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ توحید الوہیت کو اصل سمجھتے ہیں، تمباکو نوشی کے خلاف ہیں، مگر قہوہ نوشی ان کے یہاں جائز ہے، ان لوگوں کی بد قسمتی یہ ہے کہ جناب رسول ہاشمی ﷺ کی پیشین گوئیاں نجد والوں کے خلاف ہیں، ان کے مشاراً علیہ یہی لوگ خیال کئے جاتے ہیں۔

ابن عبد الوہاب کو حکومت کی مدد حاصل تھی، ابن سعود یعنی امیر درعیہ عثمان نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی اور اپنی صاحبزادی کی شادی بھی اس سے کر دی تھی، اس طرح دونوں کو فائدہ ہوا، اس کی تعلیم و مذہب پر سیاست کا غلبہ رہا، اس کی اصلاح کی یہی خصوصیت اس کے مہمل ہونے کا ثبوت ہے۔

ہندوستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا تجدد یقیناً کامیاب ہوا، انہوں نے اپنے والد سے سلسلہ صابریہ میں بیعت کی تھی، بعد میں سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے اور ان سے خلافت پائی، اس عہد میں علماء سوء اجتہاد اور بدعت حسنہ کے حیلہ سے فسق و فجور میں مبتلا تھے، اور صوفیائے خام نے کرامات کی دکانیں کھول دی تھیں، شہنشاہ اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں پابند مذہب تھا اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اس نے عبادت خانہ کی بنا ڈالی تھی، مگر علماء کی نفسا نفسی، جاہ طلبی اور آپس کی ضدوں نے اکبر کو دل برداشتہ کر دیا، اس کی مایوسی دیکھ کر ابوالفضل اور بیربل نے اسے صاحب زمان بنا دیا اور دین الہی وجود میں آ گیا، عبادت خانہ بت خانہ بن گیا، اکبر کے الحاد کی مخالفت جن بزرگوں نے کی ان میں حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سرفرہرست ہے، انہوں نے دین کی تعلیم سلوک

پر مقدم رکھی، احیاء سنت اور اجتناب بدعت پر خاص طور پر زور دیا ہے، جزیہ کی موقوفی پر انہیں طلال تھا، ذبیحہ گاؤ کو وہ اعظم شعائر اسلام میں شمار کرتے ہیں، وحدت الوجود کا مسئلہ مختلف فیہ تھا، بہ تقلید شیخ علاء الدولہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ وحدت الشہود و کورانج کیا، حضرت کا ارشاد ہے کہ حال تابع شریعت ہے اور شریعت تابع احوال نہیں ہے، شریعت و طریقت کے خلاء کو دور کر کے دونوں میں ربط و ضبط قائم کیا، شیعہ عقائد کی تردید کی، رسوم قبیحہ کی اصلاح فرمائی اور بدعتوں کو مہمل ثابت کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دعویٰ الہی کا تخیل اکبر بادشاہ کو مجدد بنانے کے لئے ابوالفضل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، اسی غرض کے لئے سنہ ہجری کے بجائے اس نے سنہ الہی ایجاد۔

حضرت سرہندی کو مجدد الف ثانی ہونے کا اشارہ غیب سے ہوا تھا، حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی اصلاح و تجدید ان کا زبردست کارنامہ ہے، مجدد رحمۃ اللہ علیہ سراپا ادب اور معلم ادب ہیں اور ابن تیمیہ اور ابن عبد الوہاب بے ادبوں کے سردار ہیں، مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تجدید نے اکبری الحاد کا خاتمہ کیا، لیکن جہانگیری و شاہ جہانی دور میں اتنی مقبولیت نہیں ہوئی جتنی عالمگیری عہد میں ہوئی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق وہابیہ نے جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے ”مسک امام ربانی“ از مولانا سعید احمد نقشبندی نامی کتاب کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

۱۱۱۴ھ۔۔۔۱۱۷۶ھ

۱۷۰۳ء۔۔۔۱۷۶۲ء

اس زمانہ میں ہندوستان عجیب کشمکش میں تھا، سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط و زوال پر معاشرے کے انتشار و ابتدال کی داستان سے ہندوستان کی تاریخ بھری ہوئی ہے، انفرادیت کا غلبہ جب ہو جاتا ہے تو صورت حال کچھ اسی قسم کی ہو جاتی ہے، نفسانیت کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کرتے اور زندگی کے ہر شعبہ میں رخنے پڑ جاتے ہیں، وحدت کے جاتے رہنے سے مغلیہ حکومت مختلف ریاستوں میں منقسم ہو گئی، شریعت و طریقت میں افتراق واقع ہو گیا، تہذیب و اخلاق کی صورتیں بدل گئیں اور دہلی اپنی سیاسی و مذہبی عظمت سے محروم ہو کر اوباشوں کی تفریح گاہ بن گئی، اس خلفشار کو دور کرنے کے لئے چند بزرگ ہستیاں بروئے کار آئیں اور انہوں نے از سر نو سب کو جمع کر کے اجتماعیت کو تقویت دینا چاہی، سب سے پہلے شاہ عبدالرحیم نے حدیث کی تعلیم و اشاعت کے لئے مسجد فتح پوری میں مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے انہوں نے ہی نظام الملک آصف جاہ اول کو خط لکھا کہ مرہٹوں سے جہاد کریں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ کے دروازے کھول دیئے، شاہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیری دروازے میں اپنا مدرسہ جاری کیا، پھر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ رحیمیہ کو فروغ دیا، اگرچہ ان حضرات کا طریق تبلیغ جدا جدا تھا، مگر ایک دوسرے کے مدد و معاون تھے، ان حضرات کی مساعی جمیلہ کا انعام یہ ملا کہ ان کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی، ان پر ستم ڈھائے گئے اور ہر طرح



اذیتیں دی گئیں، مگر یہ دھن کے پکے برابر تبلیغ میں منہمک رہے۔

روایت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ابن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے یا یہ کہ وہاں دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ (۱) ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپس آ کر شاہ صاحب نے پہلی کتاب ”ابلاغ المسبین“ تصنیف فرمائی تھی، (۲) اس میں ابن عبدالوہاب کے بعض مضامین کی تائید کی تھی، لیکن بعد میں ان مضامین کو ترک کر کے اس کتاب کو ضائع کر دیا، لہذا ان کی تصانیف میں اس کتاب کا ذکر نہیں پایا جاتا، مولانا ابوالکلام کا بیان ”ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی“ کے صفحہ ۳۵۴ پر اسی حقیقت کا اعادہ کر رہا ہے کہ ”شاہ ولی اللہ جو عین محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور و شیوع عقائد کے زمانہ میں حرمین میں مقیم تھے، کتاب ”التوحید“ کو دیکھ کر ان کے خیالات میں بھی گو نہ فطور ہوا، وہ اس فتنہ کو اپنے ہمراہ لائے۔“ یہاں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ شاہ ولی اللہ دامن نہ بچا سکے، (۳) اگرچہ ان کی زندگی میں ان کی خاص تصنیفات شائع نہیں ہوئی تھیں، ان کے محرم راز شاگرد مولانا محمد عاشق نے لکھا ہے کہ خاص خاص لوگ ان کے خاص ذوق و شرب سے واقف تھے، تاہم ”حجۃ اللہ البالغہ“ اور ”تہہیمات الہیہ“ پر لوگوں کی نظریں پڑ چکی تھیں اور گوان کی صولت علم، ذی تصوف و طریقت ہونے کی وجہ سے زیادہ فتنہ نہ اٹھ سکا تاہم لوگوں کے دلوں میں گرہیں پڑ چکی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے ان خیالات کی تائید مولوی عبید اللہ سندھی نے بھی کی ہے اور ان کی کتاب ”شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک“ میں یہ مفہوم موجود ہے۔

- ۱۔ اسی قسم کی بات شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ”رود کوثر“ مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۵۴۳ پر بھی لکھی ہے۔ یہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے جس کا کوئی ثبوت اور دلیل نہیں۔ (خلیل احمد رانا)
- ۲۔ بلاغ المسبین، شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرف منسوب جعلی کتاب ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر ذاکر محمد ایوب قادری کا مقالہ ”شاہ ولی اللہ سے منسوب بعض رسالے مجلہ ”تحقیق“ شمارہ خاص (۱۰-۱۱) ۱۹۹۷ء، مطبوعہ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جامشورو، ۱۹۹۸ء، ص ۷۱۔ (خلیل احمد رانا)
- ۳۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حالات پر مشتمل مفصل و مستند کتاب ”القول الجلی“ از شاہ محمد عاشق پھلتی، کی دریافت نے ایسی تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اصل مخطوطہ کا عکس دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (خلیل احمد رانا)

بہر حال شاہ ولی اللہ نے ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنے اجتہاد سے تدابیر نافع ایجاد کی ہیں، ان کی تحریک مذہبی، اخلاقی، سیاسی اصولوں پر مبنی تھی، ان کا استدلال استغراقی بھی ہے اور استخراجی بھی ہے، وہ مشائی اور اشراقی مکاتب کے سنگم ہیں، مخالفین میں اتحاد پیدا کرتے ہیں، وحدت الوجود کے قائل ہیں، اس لئے ان کے افکار میں جامعیت ہے، حنفی، شافعی اختلافات میں تطبیق کی ہے اور شریعت و طریقت کے فرق کو دور کیا ہے، حدیث و فقہ میں راہ اتحاد نکالی ہے، اہل دین اور اہل عقل میں سمجھوتہ کرانے کے لئے قرآن و حدیث وضاحت قدیم و جدید فلسفہ کے ذریعہ کی ہے، ارشاد ہے کہ اہل دین کلی تصورات پر جمے بیٹھے ہیں اور ارباب عقل جزوی امور میں الجھ کر رہ گئے ہیں، مگر دونوں حقیقت سے دور ہیں، انہوں نے نہ صرف صوفی و ملا کے اختلافات کو دور کرنا چاہا بلکہ نظام حکومت کو بدلنے کی بھی تجاویز بتائیں تاکہ اجنبی و اغیار کے تسلط سے نجات مل سکے، انہوں نے دو مغلیہ بادشاہوں کا زمانہ پایا، خلفشار کو بہ چشم خود دیکھا، سیاسی احوال میں ابتری تھی، علماء جہل و غوایت میں مبتلا تھے، فرقہ بندیوں کا زور تھا، مباحثوں کا شوق تھا، غرض ہندی مسلمان پر سیاسی، اقتصادی، معاشرتی و مذہبی تباہیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی تحریک کی اشاعت کے لئے جمعیت مرکزیہ قائم کی تھی، جس کی شاخیں نجیب آباد، بریلی اور سندھ کے مشہور شہر ٹھنڈہ میں کھل گئی تھیں لیکن بایں ہمہ ان کی تعلیم کتاب میں بند رہی، بجائے عملی ہونے کے قوی ثابت ہوئی، اس لئے کہ اس کی تعمیل کرنے کے لئے فضاء میں آثار نہیں تھے، عقائد کی درستی، بدعت اور اصلاح رسوم ان کے مقاصد عظیم تھے لیکن غلط ذہنیت نے بدترین مخالفت پر کمر باندھ لی، پھر انگریزی حکومت کب گوارا کر سکتی تھی کہ شاہی نظام حکومت کی اصلاح کی جائے، اس زمانہ کی حالت کا نقشہ کسی دوست کو بزبان عربی لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے، مذہب کا سرچشمہ مگر ہو گیا ہے، جو پوشش مسلمانوں کو رونق دے رہی ہے وہ غیر اسلامی ہے، ضرورت ہے کہ پانچ قسم کے

لوگوں سے پرہیز کیا جائے۔

۱۔ جھگڑا و معقولی سے جو شکوک و اوہام کو شدہ دیتا اور خدا کا مطیع و منقاد نہیں ہے۔

۲۔ ۲۔ شیخی خور فقیہ سے جو مردہ قوتوں پر خوش ہوتا ہے اور نبی پاک ﷺ نے جن باتوں کی توضیح فرمائی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا ہے۔

۳۔ خشک زاہد سے جو دین میں اس درجہ تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں کوئی اجازت نہیں ہے۔

۴۔ بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

۵۔ سرکش مالدار سے جو تکلف بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرتا ہے اور ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔

بہر حال ان کی تصنیفات ان کے اصول تعلیم سے لبریز ہیں، اور اس کا خلاصہ انہوں نے اپنے وصیت نامہ میں بھی کھول کر مختصراً بیان کیا ہے، معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصلاحات کی تھیں۔

۱۔ نکاح بیوگان کا اجراء۔

۲۔ بڑے مہربانہ ہنسنے کی ممانعت۔

۳۔ غمی و خوشی کے مواقع پر اسراف سے پرہیز، رسوم چہلم، چھ ماہی و برسی کی ممانعت۔

مذہبی اصلاحوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اجتہاد کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر یہ عوام کا کام نہیں ہے۔

۲۔ اختلافات میں تشدد کے مخالف ہیں، اس لئے کہ اس سے تنگی پیدا ہوتی

ہے، دین کے معاملہ میں وسعت کی ضرورت ہے۔

۳۔ عامی کو مجتہد کا مقلد ہونا چاہیے ورنہ نظام شرع درہم و برہم ہو جائے گا،

مگر تقلید میں اعتدال ضروری ہے۔

۴۔ نفی خودی کے بارے میں مشائخ سے انہیں اختلاف تھا۔

۵۔ اغیار سے نجات پانے کے لئے جہاد کو ضروری لکھا ہے، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ حکومت کرنے کی قابلیت افغانوں میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس لئے نجیب الدولہ کو ترغیب دی کہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دیں، گویا پانی پت کی فتح کے ذمہ دار شاہ صاحب ہی ہیں، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ جہاد کیا جائے، لیکن اس وقت جبکہ عقائد ٹھیک ہو جائیں، اقتصادی حالت سنبھل جائے اور صحیح احساس کے بعد مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے، حجۃ اللہ البالغہ میں عقائد و عمل کی وضاحت کر کے صراط مستقیم دکھائی ہے، شاہ صاحب کے وصال کے دو سال بعد شاہ عالم نے کمپنی بہادر کو دیوانی کے حقوق دیئے تھے، ان کا وصال لارڈ کلايو کے جانے کے بعد اور میر جعفر کے انتقال سے تین برس پہلے ہوا تھا۔

### شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ ولی اللہ نقش اول تھے اور ان کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسم باسمی ہونے کی وجہ سے نقش ثانی تھے، مذکور ہے کہ ”وے جامع علوم بلکہ آیت الہی بود“ والد کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کے وقت دستار باندھتے ہوئے ان کے کان میں شاہ فخر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، تمہارے والد کی چادر پر ایک سیاہ دھبہ ہے تم اسے دھونا، یہ اشارہ تھا مضامین بلاغ المبین کی طرف، (۱) مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی لکھا ہے کہ والد مرحوم کہتے تھے کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز کی سجادہ نشینی کی مجلس میں شاہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سر پر

۱۔ حضرت مولانا فخر الدین دہلوی علیہ الرحمۃ نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی کتاب ”الاعتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ“ میں اتصال نسبت کے حوالے سے ایک شبہ پر بات کی تھی، فخر الطالین و مناقب فخریہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ شاہ ولی اللہ نے آخر میں اپنا خیال بدل لیا تھا، بلاغ المبین والی بات درست نہیں۔

پگڑی رکھی تو کان میں کہا کہ تمہارے خاندان کی چادر پر ایک دھبہ لگ چکا ہے، اپنی سعی و ہمت سے اسے دھو ڈالنا، شاہ ولی اللہ کے متعلق مشہور تھا کہ اپنے ذوق فن میں اعتراف کی طرف بھی ان کا میلان رہا ہے، چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے کمال سادگی اور خوش اخلاقی سے اس سیاہ دھبہ کو دھو ڈالا، ان مسائل میں والد کی تقلید نہیں اور تعلیم ولی اللہ میں بے حد فراخی و وسعت پیدا کی، عظمت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دہلی سے لے کر کلکتہ و پشاور تک شاگردوں اور مریدوں کا سلسلہ پھیل گیا، علمائے ہندوستان بغیر ان کا مشورہ لئے اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے اور نزاعی مسائل میں حجاز، روم اور شام کے علماء ان سے ہی رجوع کیا کرتے تھے، ان کی تصانیف و تقاریر سے ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے، آخر میں کثرت امراض کی وجہ سے جسمانی طاقت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن برکات باطنی اور حدت قوی روحانی کی بدولت جب مسائل کی شرح فرماتے تو ایک دریائے زخار موجزن ہو جاتا اور حاضرین و سامعین پر کیفیت طاری ہو جاتی، ہفتہ میں دو بار مجلس و عطا منعقد کرتے تھے، مخلوق مور و ملخ کی طرح جمع ہو کر رشد و ہدایت حاصل کرتی تھی، خود فرمایا کرتے تھے کہ باوجود بیماریوں کے جو اس اس لئے قائم ہیں کہ خادم حدیث سے ہرزہ سرائی سرزد نہیں ہو سکتی، میں بچپن سے اسی کام میں ہوں، حضرت کی خدمت میں اجناء بھی درس لینے حاضر ہوا کرتے تھے اور حضرت کی رسائی ارواح مقدسہ کی خدمت میں بھی تھی، ملفوظات میں بر ملا ہدایت کی ہے کہ بزرگان سلف کی روحوں سے توسل و استمداد حاصل کرنا چاہیے کہ اس میں ان کو بڑا دخل اور بڑی قوت حاصل ہے، فرمایا کہ شب برأت میں نان یا حلوہ پر فاتحہ دینا اور قبرستان میں جا کر فاتحہ پڑھنا رسول پاک ﷺ کی سنت ہے، علی محمد خاں رئیس مراد آباد کے جواب میں فرمایا کہ!

”فقیر کے مکان پر سال بھر میں دو محفلیں ہوتی ہیں، محرم کے دسویں دن یا ایک دو دن پہلے، قریب ایک ہزار آدمی کم و بیش آتے ہیں، پھر بعد فاتحہ جو کچھ موجود ہوتا ہے تقسیم کر دیا جاتا ہے اور بارہویں تاریخ ربیع الاول کو



اسی قدر آدمی ہوتے ہیں، حال ولادت شریف، رضاع و حلیہ وغیرہ بیان کر کے جو کچھ کھانا یا شرینی ہوتی ہے اس پر فاتحہ دے کر تقسیم کر دی جاتی ہے۔“

ملفوظات میں یہ بھی لکھا ہے کہ تیوہاروں میں روحمیں آتی ہیں، عید میں، عشرہ محرم وغیرہ میں، حدیث کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ حضرت ایوب انصاری ؑ حضرت ؑ کے مزار مبارک پر منہ رکھے ہوئے رو رہے تھے، اس سے بزرگوں کے مزار پر بوسہ دینے کی حجت نکلتی ہے، مردے کے سر ہانے پھول یا خوشبو رکھی جائے تو اسے پہنچ جاتی ہے، قبر کو سجدہ گاہ نہیں بنانا چاہیے، بزرگوں کے نام پر بکرے وغیرہ ذبح کرنا ممنوع ہے، خدا کے نام پر کر کے ان کو ایصال ثواب کرنا چاہیے، شریعت مستقل طریقت کا نام ہے، فنا و بقا کا کمال یہی ہے کہ عشق و شوق کے ساتھ شریعت محمدی کا اتباع کیا جائے، شیطانی خطرہ میں اصرار نہیں ہوتا اور نفسانی خطرات پئے بہ پئے آتے ہیں، نفسانی خطرات زیادہ سخت ہوتے ہیں، اس لئے کہ نفس انسان کے ساتھ جنگ کرتا ہے، اس طرح جیسے مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ میں کی جاتی ہے، نفسانی وساوس مشکل سے رفع ہوتے ہیں، کیونکہ نفس باقاعدہ منظم صورت سے جنگ کرتا ہے اور شیطان دور سے نظر آتا ہے، نفس کا سامان جنگ عورت، اولاد، لباس و مال و متاع ہیں، شیطان ادنیٰ جنگ سے رفع ہو جاتا ہے اور نفس بڑی کوشش اور دقت سے صحیح ہوتا ہے، دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، شیطان کا علاج ذکر اللہ اور تلاوت قرآن ہے اور دنیا کا علاج زہد و تقویٰ ہے، مخلوق کا علاج گوشہ نشینی ہے مگر نفس کا علاج دشوار ترین ہے اور سمجھنا مشکل ہے، نفس کی جو خواہش ہو تو کوئی ہرگز اس کے مطابق نہ کرے مگر شریعت کے اتباع میں کام کرے، عجب و حسد شیطان کے داؤ ہیں، عجب عبادت سے تعلق رکھتا ہے، کلال و طوائف عجب کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ (ملفوظات عزیزی ص ۱۳۴)

یہ سمجھنا چاہیے کہ پیر کی اتباع سلوک ذکر و فکر میں ہوتی ہے اور معارف و کشفات خود اپنے ہوتے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد

کے نظریہ کے خلاف تھے کیونکہ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ غالص و جوہی نظریہ رکھتے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ لوگ کم سمجھتے ہیں، تجلی الہی جو اولیاء پر، پر تو فکرن ہوتی ہے، جس سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں، بعض اوقات صرف اپنے ہی وجود پر نظر ہوتی ہے، جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ ”میں نے ہی حضرت نوح کی کشتی کو ٹھہرایا تھا، میں ہی قیامت کا باعث ہوں، میں زندہ رہوں گا، مجھے موت نہیں آئے گی، یا دوسرے بزرگ جو اپنے اندر تجلی الہی پاتے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ نے تجلی الہی کا نظارہ کیا پر فرمایا کہ میرا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے ہاتھ پر ہے یا یہ کہ تو نے پتھر نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا ہے، درحقیقت ایک مٹھی سنگریزے ایک ہزار آدمیوں کی آنکھوں کو کیسے اندھا کر سکتے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہی معلوم ہوا کہ جو ہاتھ خدا کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہو، اس ہاتھ سے شرم گاہ کو کیسے چھوا جاسکتا ہے، جس طرح دریا سے ایک کوزہ پانی بھر کر لائیں، جب برتن کی قید اور دریا کی جدائی پانی کو دیکھے گی تو تامل کرے گی کہ میں ہی ہوں جس میں جاری ہوتی ہیں کشتیاں وغیرہ، میں ہی دریا ہوں، میں ہی اکبر آباد میں ہوں میں ہی سارنگ پور میں ہوں، غرض کہ اس کی قسم کی باتیں اس سے ظاہر ہوں گی، اسی کو تجلیات کہتے ہیں، وجودی و شہودی سب ان تجلیات کے قائل ہیں، یہ حال ہمیشہ ہر شے کی حقیقت میں ہوتا ہے یا نہیں، ہم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ اور تحقیق ہے، اگر ذرا تامل کیا جائے تو ہر چیز کی نفس الامر تحقیق پر موقوف نہیں ہے بلکہ سلوک کی غرض و غایت یہ ہے کہ تجلیات الہی کا وجود ہے، اگر اس کا وجود نہ ہو تو ولی کا وجود نہ ہو۔ (ملفوظات عزیزی ص ۱۹۰، ۱۹۱)

شاہ صاحب نے اپنے عہد کی تصویر لطف کے ساتھ کھینچی ہے!  
 ”اس زمانہ میں سلامتی ہونے کے لئے منہیات کے ارتکاب کی ضرورت نہیں بلکہ قرآن ہاتھ میں رکھنا اور قرآن و حدیث پر عمل کرنا سلامتی بننے کے لئے بس ہے، کیونکہ ایسے آدمی کو آج کل برا سمجھا جاتا ہے۔ (ملفوظات ص ۱۹۴)

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں نصاریٰ کا تسلط ہوگا، ملک کفر کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے، مگر ظلم کے ساتھ نہیں، اہل اسلام میں ظلم شائع ہو گیا ہے اور ارشاد رسول کریم ﷺ ہے کہ ان (نصاریٰ) کو مہدی علیہ السلام قتل کریں گے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ عالم اور اکبر شاہ کے عہد دیکھے تھے۔ لارڈ ہیسنگو نے ۱۸۳۳ء میں استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے سال بھر بعد شاہ صاحب کا وصال ہوا۔ فرمایا: ”امن صرف طاقت کے سہارے قائم ہو سکتا ہے۔ دنیا دار ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔“

سیاست کے متعلق ان کے فتوؤں سے ان کی وسیع النظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی تعلیم کا جب اجراء ہوا تو مسلمان اس کے خلاف تھے، مگر شاہ صاحب نے زیروزبر بنا کر فتویٰ دیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں فائدہ ہے۔ انگریز کی ملازمت کرنے کے متعلق فتویٰ دیا کہ خاص اشکال سے جائز ہے۔ جلاوطنی کے بعد جو نیور سے واپس آ کر دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور وہ یہ ہے:-

”دارالاسلام، دارالحرب نہیں ہوتا، مگر تین چیزوں سے۔“

۱۔ احکام شرک جاری کرنے سے۔

۲۔ دارالحرب کے متصل ہونے سے اور اس وجہ سے کہ نہ باقی رہے اس میں کوئی مسلمان یا ذمی امن کے ساتھ۔ جس طور سے کہ پہلے امن تھی اپنی جان کی۔۔۔۔۔ مراد دارالحرب سے وہ شہر ہے کہ جن میں کفار کے بڑے کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اس شہر میں حکم امام المسلمین کا قطعاً جاری نہیں ہے۔ اور حکم رؤسا نصاریٰ کے لئے دغدغہ جاری ہیں۔ مراد جاری ہونے احکام کفریہ سے یہ ہے کہ معاملہ ملک داری و بندوبست رعایا اور خراج و باج و عشور، اموال تجارت و سیاست،

قطاع الطريق اور چوروں کی، اور فیصلے لڑائی جھگڑوں کے اور سزا گناہوں کی۔ کفار بطور خود دیتے ہیں۔ ہاں اگر بعض احکام اسلام کا، مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبیحہ بقر کے تدارک نہ کرتے ہوں، لیکن اصل اصول ان چیزوں کا ان کے نزدیک غلط و بیکار ہے۔ اس لئے کہ مسجدوں کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں اور کوئی مسلمان یا ذمی بغیر امن حاصل کئے ہوئے ان کے اس شہر میں اور اطراف میں نہیں آسکتا۔ اپنی منفعت کے لئے وار دین اور مسافرین و تجار کی مخالفت نہیں کرتے ہیں، اور دوسرے اعیان مثل شجاع الملک اور ولایتی بیگم بغیر ان کے حکم کے ان شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس شہر سے کلکتہ تک عمل نصاریٰ پھیلا ہوا ہے، دائیں بائیں مثل حیدرآباد لکھنؤ و رامپور نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں۔۔۔۔۔ سبب معالجت و اطاعت مالکان ان ممالک کے۔۔۔۔۔ (عہد نبوت اور حضرات شیخین کے زمانہ میں دارالحرب بتائے جانے کی مثالیں ثبوت میں پیش کی ہیں۔ (فتاویٰ عزیزی، جلد اول ص ۱۷) لکھنؤ، و رامپور دارالحرب نہیں بلکہ کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دارالحرب ہے۔ (ملفوظات عزیزی ص ۱۷۳)۔۔۔۔۔ یعنی اس فتویٰ میں شاہ صاحب نے انگریزوں کے ہی نہیں بلکہ سکھوں کے وحشیانہ و ظالمانہ طریقہ پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ شاہ صاحب ضعف زمانہ اور اپنی بیماریوں کی وجہ سے خود جہاد نہ کر سکے، مگر جہاد کا فتویٰ دے کر جہاد کا راستہ کھول دیا تاکہ تحریک ولی اللہی کی تعمیل کی جاسکے، مذہبی و معاشی اصلاحیں جو شاہ ولی اللہ نے فرمائی تھیں، ان پر عمل کروانے کی بہترین کوشش کی اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی۔ شاہ صاحب کا وصال ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء کو ہوا۔ مومن خان نے تاریخ وصال لا جواب لکھی تھی۔“

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے  
فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم، علم و ادب

شاہ عبدالعزیز صاحب کے اولاد زینہ نہیں تھی مگر اولاد معنوی بے شمار تھی۔  
تین صاحبزادیاں تھیں، ایک مولوی عبدالحی کو بیاہی گئی تھیں، دوسری کی شادی شاہ رفیع  
الدین کے صاحبزادے مولوی عیسیٰ صاحب سے ہوئی تھی۔ مولوی عیسیٰ کے حقیقی بھائی  
مولوی مخصوص اللہ تھے، تیسری شیخ محمد افضل کی زوجیت میں دی گئی تھیں، شیخ محمد افضل  
کے دو صاحبزادے شاہ محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب تھے، شاہ صاحب نے اپنا ورثہ و  
ترکہ اپنی تینوں صاحبزادیوں کو دیا اور اس کے بعد شاہ محمد اسحاق ان کے جانشین بنے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆



## شاہ محمد اسماعیل

شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھائی شاہ عبد الغنی مجذوب تھے، شاہ عبد القادر، چندرؤ ساہلی اور خصوصاً بخشی بھوانی شکران کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

(مقالات سرسید احمد شاہ، ص ۲۶۰)

ان مجذوب صاحب کے صاحبزادے شاہ محمد اسماعیل تھے جو ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء کو عہد دارین ہسنگز میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم و تربیت شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز کے زیر سایہ ہوئی تھی، شاہ اسماعیل نے پندرہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی، علم و فضل میں طاق اور ذہانت و فراست میں برق تھے، کچھ دن مولوی عبدالحی (بڈھانوی) کی شاگردی میں رہے تھے اور بعد میں کچھ دن سید احمد رائے بریلوی کو پڑھایا تھا، ان کی تقریر دل کش تھی، وعظ بے تکان فرماتے تھے اور تحریر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شہ سواری، سپہ گری، پہلوانی اور تیراکی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ترکہ اپنی صاحبزادیوں کو دیا تھا اور وصال سے کچھ پہلے اپنے نواسے شاہ محمد اسحاق کو اپنا جانشین بنایا تھا، شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی کو اس بات سے مایوسی ہوئی، شاہ صاحب کو شاہ اسماعیل کا خیال تھا اس لئے شاہ رفیع الدین کے انتقال کے بعد ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں شاہ اسماعیل کو ان کی مسند درس عطا کر دی، شاہ اسماعیل نے شاہ عبد العزیز کے مسلک کے خلاف اپنا مسلک بنایا تاکہ اہمیت حاصل کر سکیں، ان کے عقائد نجدیوں سے ملتے جلتے ہیں، اپنے مسلک کی اشاعت ابتداء میں طبقہ اسفل سے شروع کی، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ دینے

شروع کئے، ان کی جادو بھری تقریروں سے لوگوں کا رجحان ان کی طرف بڑھنے لگا، خاندان کے علماء اور مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں تنبیہ و فہمائش کی مگر وہ اپنی روش پر قائم رہے، چنانچہ مناظروں اور مباحثوں کی وجہ سے فتنہ کا اندیشہ ہوا تو ریزیدنٹ چارلس مٹکاف (۱۸۱۱ء) نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے کی ممانعت کر دی، شاہ اسماعیل نے ریزیدنٹ سے صفائی کرنا ضروری سمجھی، اس زمانہ میں انگریز آرزو کرتا تھا کہ صاحب اثر علماء و شرفاء سے ربط و ضبط پیدا کرے، ریزیدنٹ نے بڑے تپاک سے شاہ اسماعیل کا استقبال کیا اور ان کی تقریر سے مرعوب ہو کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے کی اجازت دے دی، اس طرح دونوں میں مراسم دوستی بڑھ گئے، وعظ کی بندش سے پہلے شاہ اسماعیل نے اپنی کتاب ”رد شرک“ عربی میں تصنیف کی تھی، اس کا ترجمہ ”تقویۃ الایمان“ کے نام سے بعد میں شائع کیا، اس کا مسودہ احباب کو سناتے وقت انہوں نے اقرار کیا تھا کہ بعض جگہ شرک خفی کو شرک جلی لکھ دیا ہے، لہذا ترمیم کر کے تصحیح کر دوں گا، مومن خاں نے رائے دی کہ ایسی ہی رہنے دیجئے، بدلنے کی ضرورت نہیں، تقویۃ الایمان میں جہاد کا مطلق ذکر نہیں ہے، ریزیدنٹ نے کسی ملاقات میں یقیناً شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دارالحرب والے فتوے کا مطلب و مقصد سمجھا اور ایسا مفہوم بھی ظاہر کیا ہوگا کہ ہم لوگ کسی کے مذہب میں درانداز نہیں ہوتے اور امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر یہ فتویٰ ہمارے خلاف کیوں جاری کیا گیا ہے، برخلاف ہمارے سکھوں کو دیکھئے کہ مسلمانوں پر کس درجہ مظالم کرتے ہیں اور انہیں معافی دے دی گئی ہے۔ پتا نہیں کہ شاہ صاحب نے کس منطقی اصول سے ریزیدنٹ کی تسلی کی، مگر سکھوں کے مظالم والی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔ دارالحرب والے فتوے کے معنی سمجھے جس میں کلکتہ سے لاہور تک کا ملک دار الحرب قرار دیا ہے اور اس کا اشارہ انگریز اور سکھ دونوں کی طرف ہے پھر: ”شنیدہ کے بودماند دیدہ“ کے اصول پر پنجاب کا خفیہ دورہ کیا، سکھوں کے مظالم بہ چشم خود دیکھے اور یہ بھی ملاحظہ کیا کہ بے کس مسلمان سکھوں کی عملداری سے بھاگ کر انگریزی عملداری میں آکر پناہ لیتے ہیں۔ اور حفاظت و امن کے ساتھ رہتے ہیں، نتیجہ یہی نکالا

جاسکتا تھا کہ سکھوں سے انگریز اچھے ہیں، پھر سکھوں کے خلاف انگریز سے مدد بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے معتقدین بھی ساتھ ہو جائیں گے اور ہندوستانی مسلمان جو کارناوالس اور ورنلی کے امولوں کی وجہ سے ابتلاء میں مبتلا ہیں خود بخود ہم نوا بن جائیں گے۔

دہلی واپس آ کر تکالیف برداشت کرنے کی عادت ڈالنا شروع کر دی۔ تیرنے لگے۔ ننگے پاؤں تپتی زمین پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پیاس اور بھوک پر غالب آنے کی مشق کی۔ گویا ہر تکلیف کو راحت بنا لیا۔ اور سکھوں کے خلاف اجرائے جہاد کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس عرصہ میں دہلی کارپریڈنٹ بدل گیا تھا اور اس کرم فرما کے بجائے ڈیوڈ آکٹر لونی ریڈنٹ ہو کر دوبارہ آ گیا تھا، جس سے شناسائی نہ تھی۔ اندریں حالات اپنے استاد مولوی عبدالحی (۱) کو ہمزاز بنا کر مشورہ کر سکتے تھے۔ اور چونکہ مولوی صاحب میرٹھ میں انگریز کے دفتر میں ملازمت کرنے کی وجہ سے صاحبان والا شان کے مزاج اور عادات سے بھی واقف تھے۔ ان سے بھی بہترین مدد ملنے کی پوری امید تھی۔ جب مشکلات کی وجہ سے اسکیم تیار نہ ہو سکی تو مولوی عبدالحی نے مشورہ دیا کہ اس مشکل کو سید احمد صاحب سے حل کرنا چاہیے اور وہ اپنی روحانیت سے صحیح رائے بتادیں گے۔ بقول سرسید احمد خاں:

”مولوی محمد اسماعیل قائم مقام علوم رسمی کی درس تدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے۔“

(مقالات سرسید حصہ شانزدہم، ص ۱۳۶)

وہ اس تجویز پر راضی ہونے والے نہ تھے۔ مگر غرض بری بلا ہوتی ہے، مولوی عبدالحی کے ساتھ انہیں سید احمد صاحب کی خدمت میں جانا پڑا۔ سید صاحب کی روحانیت کی عام شہرت تھی۔ اور یہ بھی مشہور تھا کہ امیر خاں کونواہلی انہوں نے ہی دلوائی ہے اور اس معاملہ میں ڈیوڈ آکٹر لونی کا بھی دخل تھا۔ لہذا یہی دو امور ایسے تھے جن کی

۱۔ بذعان ضلع مظفرنگر کے رہنے والے تھے، شاہ عبدالعزیز کے بھانجے، شاگرد اور داماد تھے۔ مدرسہ رحیمیہ میں معلم رہے تھے۔ علمی فضیلت اور طبعی متانت کی وجہ سے انہیں تفوق حاصل تھا اور شاہ عبدالعزیز کے معتقد خاص تھے۔

وجہ سے شاہ اسماعیل سید احمد صاحب کی خدمت میں جانے کو تیار ہو گئے۔ سید احمد صاحب نے جس طرح دو نفل مولوی عبدالحی کو پڑھوا کر متاثر کیا تھا، اسی طرح شاہ اسماعیل کو بھی دو نفل پڑھنے کی فہمائش کی۔ دو سجدوں میں سارا وقت گزر گیا۔ علم معقول شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ فہم و فراست اس کی توجیہ نہ کر سکی۔ وہ سمجھتے تھے کہ روحانیت بغیر عقل کے ایسی ہے جیسے خود رو گھاس، لیکن عقل کے ذریعہ اس سے گل و ثمر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس مشاہدہ سے حیرت اس درجہ ہوئی کہ سکھوں سے جہاد کرنے کا تصور غائب ہو گیا۔

”شاہ اسماعیل نے سید احمد صاحب کی خاص باتوں میں اطاعت قبول کر

لی اور سنت نبوی کے مطابق بیعت بھی کی“۔ (حیات طیبہ ص ۲۰۹)

میرزا حیرت کی اس صداقت کا ثبوت شاہ اسماعیل کے عقائد و اعمال سے مل جاتا ہے۔ بہر حال شاہ اسماعیل سید صاحب کی روحانیت سے زیادہ ان کی مقبولیت کے قائل ہوئے، کیونکہ ان کی مقبولیت سے انہیں کام لینا تھا۔ سید احمد صاحب روحانی آدمی تھے۔ ان کی رطف مخلوق کا رجحان بھی اسی وجہ سے تھا مگر انہیں دنیوی و سیاسی امور کی سوجھ بوجھ مطلق نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اپنے ”علم لدنی“ یا روحانیت سے کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ بچپن میں بجائے تعلیم حاصل کرنے کے انہوں نے سودا سلف لا کر محلہ والوں کی خدمت کی۔

مدرسہ رحیمیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہاں کے رہنے والے درویشوں کی خدمت کی اور امیر خان کے یہاں رہ کر بھی سپاہیوں کی برابر خدمت کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ اسی خدمت سے انہیں عظمت حاصل ہوئی تھی۔ ایسے بزرگوں سے ان کی وجدانیت کے باعث ان کے معتقدین و خدام ان سے اپنی عجیب عجیب من مانی اغراض منوالیا کرتے ہیں، اور نیا بھر میں ایسی باتوں کو کرامت سے مشہور کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ واقعات سے ثابت ہے کہ شاہ اسماعیل نے یہی کیا۔

یہ صحیح ہے کہ سیاست مذہب کی لونڈی ہے، مگر شاہ اسماعیل کا تصور تھا کہ مذہب میں اختراع کر کے اپنی نئی حکومت بنا لیں گے اور حاجی شریعت اللہ سے سبقت لے جائیں گے، مگر ان کی جدتیں تیز مزاجیاں اور تنگ نظریاں تفرقہ کا باعث بنیں۔ ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، ان کی تعلیم آج تک اتحاد سے محروم ہے۔ ان عبدالوہاب کی تقلید میں یہاں کی حکومت کو اپنا سر پرست بنانا چاہا، مگر انگریز ان سے زیادہ ہوشیار تھا۔ جب تک سکھوں سے باوجود معاہدہ خوف رہا، شاہ اسماعیل کو اکہ کار بنایا۔ مگر ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کے معتقدین پر وہ ستم ڈھائے کہ توبہ ہی بھلی، کیونکہ اب رنجیت سنگھ اور انگریز کے درمیان دائمی صلح کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ سید صاحب کی روحانیت شاہ اسماعیل کی خود رانی اور تیزی مزاج کو کیوں نہیں دور کر سکی۔ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سید صاحب کی روحانیت اس درجہ کامل نہیں تھی، یا شاہ اسماعیل کی استعداد میں نقص تھا، دونوں وجوہ صحیح ہو سکتے ہیں، مگر بظاہر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہ اسماعیل بجائے حقیقت پر غور کرنے کے اپنے علم معقول کی بنا پر فروعات میں مبتلا ہو گئے، معقولات سے پیدا ہونے والی ضد اور نخوت نے بے باک بنا کر ادب سے بھی بے نیاز کر دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدات سے شاہ اسماعیل کے اختراعات نہیں ملتے، اگرچہ مصلحتاً شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے ہی منسوب کئے جاتے ہیں، شاہ اسماعیل کے اختراعات ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی حسین کی کمر ہو، اور کمر کی تعریف میرزا غالب جیسے رند شاعر نے بڑے لطف سے بیان کی ہے:

ہے کیا جو کس کے باندھے، میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اپنی کتاب ”تحقیق الحقیقۃ“ (۱) میں مولانا فضل رسول بدایونی علیہ الرحمۃ نے

مولوی مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ (فرزند رشید شاہ رفیع الدین) کی روایت لکھی ہے



کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نابینائی کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے، جب تقویۃ الایمان کی بابت سنا تو فرمایا:

”اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفہ اثنا عشریہ کی طرح اس کا بھی رد لکھتا۔“

اس کے علاوہ یہ بھی سنا ہے کہ شاہ اسماعیل اپنے اختراعات کے متعلق دوسروں کے ذریعہ شاہ عبدالعزیز سے اکثر استفسار کیا کرتے تھے اور ہم خیالی نہ دیکھ کر چپ ہو جایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ اسی تحقیق الحقیقہ کے صفحہ ۱۳ پر مندرج ہے کہ مولوی مخصوص اللہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ ”اسماعیل کو ہم لوگوں نے سمجھایا، نہیں مانا اور جتنا ہندوستان میں فتنہ پھیلا ہے، اسی کی ذات سے پھیلا ہے۔“ اور یہ بھی کہا کہ ”حق یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں یہ دو شخص اسماعیل و اسحاق ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز و فرق، نیتوں، حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا۔“

شاہ اسماعیل قرون اولیٰ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی نقل کرنے کے مدعی ہیں مگر دونوں میں بعد بعید ہے، ان حضرات میں بیدار دل تھا اور ان کی نگرانی نبی پاک ﷺ کیا کرتے تھے، اور ان صاحبان میں محض دماغ تھا، جس کے زور پر نقل کرنے کا دعویٰ تھا اور سید احمد صاحب جیسی ہدایت کر سکتے تھے وہ ظاہر ہے،

چہ نسبت خاک را با عالم پاک  
ان لوگوں کا شعور صحیح نہیں تھا، اپنے عیب کو ہنر سمجھتے تھے، سید احمد صاحب کی ہدایات مضمحل ہوتی تھیں، وہ صاف بول بھی نہیں سکتے تھے، لہذا شاہ اسماعیل ترجمان بن

۱۔ رسالہ ”تحقیق الحقیقہ“ ۱۲۶۷ھ میں بمبئی سے شائع ہوا، مولانا قاضی فضل احمد لدھیانوی علیہ الرحمۃ (م ۱۹۳۷ء) نے اپنی کتاب ”انوار آفتاب صداقت“ مطبوعہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء لاہور میں صفحہ ۲۰-۶۱ پر اس رسالہ کو نقل کر دیا ہے۔ (خلیل احمد رانا)

کر وہ ظاہر کیا کرتے تھے جو خود ان کا مافی الضمیر اور منشاء ہوتا تھا، مثلاً جو معتقدات ”تقویۃ الایمان“ اور ”صراط مستقیم“ کے ذریعے ظاہر کئے گئے ہیں، وہ کبھی بھی سید صاحب کے نہیں تھے، جیسا کہ سید صاحب کے بعض اقوال و افعال سے ظاہر ہو جاتا ہے جو ان صاحبان نے خود نقل کئے ہیں، وہ نہ اس قدر باطنی و عظیم کہہ سکتے تھے اور نہ اس قدر سیاسی خطوط لکھ سکتے تھے اور نہ ایسے بیانات دے سکتے تھے، جو ان سے منسوب کئے گئے ہیں، ان سب میں علم معقول کی شمولیت اس کا اظہار کر رہی ہے، یہ تصور و اظہار کہ معتقدین کا کثرت سے ہجوم میسر آ گیا، صحیح نہیں مانا جاسکتا، انگریز کے ستائے ہوئے اس امید پر جمع ہو جاتے تھے کہ ان کے وسیلہ سے گنی ہوئی عزت و ناموس واپس مل جائے گی، ان جمع ہونے والوں میں وہ جوش و یقین نہیں تھا جو قرون اولیٰ میں تھا، یہ تو غرض اور طمع کے بندے تھے، ان مردہ دلوں کو فریب دینے کے لئے سید صاحب کو امام مشہور کر دیا تھا اور امام ثابت کرنے کے لیے بے سرو پا کراہتیں اور پیش گوئیاں مشہور کی جاتی تھیں، یہ ایسی باتیں تھیں جن سے روشنی و زندگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور اخلاق بگڑ کر رہ گئے، ہمتیں ساقط ہو گئیں اور مضمون سمجھانے والی روح جاتی رہی اور اس مذہبی انقلاب و انحطاط کا بھگتواں آج تک بھگتا جا رہا ہے۔

شاہ اسماعیل نے اپنی ایجادات میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی معاشرتی اصلاحوں کو اختیار کیا ہے اور ان کی مذہبی جدتیں ابن تیمیہ، ابن عبدالوہاب نجدی اور مشرقی بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی ممنون ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## تبلیغی دورے

بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بیعت کے بعد چھ دن کے اندر شاہ صاحب نے دولت روحانیت سے مالا مال کر کے ولایت اولیا اور ولایت انبیاء مرحمت کر دی تھی، خزانے کی کنجیاں کمر بند میں باندھ کر وہ اس دولت کے خرچ کرنے کے اہل ہو گئے تھے اور مخلوق کو تبلیغ کرنے کا حق انہیں حاصل ہو گیا تھا، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دولت کا استعمال انہوں نے صحیح کیا یا نہیں، اب جو روایتیں درج کی گئی ہیں، اور معتقدین و سوانح نویسوں نے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اسراف کیا اور دونوں ہاتھوں سے دولت کو خوب لٹایا، اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ان کی جیب و آستیں خالی ہو کر رہ گئیں، بہر حال ان فضولیات کو نظر انداز کرنے کے بعد یہ ظاہر و ثابت ہے کہ نمائش آٹھ نو برس رہی، جس کے بعد امیر خان کے یہاں سے سید صاحب دہلی آ گئے۔

فخر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ سید صاحب نے جب خط بھیجا ہے تو اسی زمانہ میں شاہ صاحب نے خواب دیکھا تھا کہ انہیں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، تفصیل یہ ہے کہ:

”جامع مسجد دہلی میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہیں، باہر کثیر مجمع مشتاق زیارت ہے، سب سے پہلے شاہ صاحب کو سعادت باریابی حاصل ہوئی، عصائے مبارک مرحمت فرما کر حکم دیا کہ دروازے پر بیٹھو اور بغیر ہماری اجازت کے کسی کو اندر نہ آنے دو۔“

فن تعبیر میں شاہ صاحب کو خود کمال تھا، مگر ازراہ احتیاط یا رسنا شاہ غلام علی صاحب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے سلسلہ کی اشاعت یا آپ سے خود ہوگی یا آپ کے کسی شاگرد رشید کے ذریعہ ہوگی، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ڈیڑھ سو برس سے یعنی سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہدایت بند ہوگئی تھی۔ (سوانح احمدی)

اس خواب کے ایک ہفتہ بعد اوائل ۱۸۱۸ء میں سید صاحب دہلی آئے، خواب کی تعبیر یقیناً ایک مژدہ ہے مگر واضح ہے کہ خواب میں عصا شاہ صاحب کو عطا کیا گیا ہے، کسی شاگرد وغیرہ کا برائے نام بھی ذکر نہیں ہے، لہذا حیرت ہے کہ یار لوگوں نے شاگرد رشید کا مفہوم کس طرح اضافہ کر دیا، سید صاحب کے دہلی آنے کے بعد انہیں خلافت دی گئی تھی اور اسی وقت شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں اور رشتہ داروں کو بھی ان کا مرید کروا دیا تھا، پھر اس قدر شہرت ہوئی کہ دور دور سے لوگ مرید ہونے کے لئے آنے لگے، اس کے بعد گشت اور دورہ کرنے کا منصوبہ گانٹھا گیا، مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دورے کا تخیل کس کے دماغ کی پیداوار ہے اور اس کا منشا کیا تھا، حیات طیبہ اور سوانح احمدی میں مذکور ہے:

”شاہ صاحب نے حکم دیا کہ آپ خود آس پاس کے شہروں میں وعظ فرمائیں، حالانکہ شاہ صاحب جانتے تھے کہ سید صاحب اپنی کج زبانی کی وجہ سے وعظ نہیں کہہ سکتے تھے۔“

جناب غلام رسول مہراپنی کتاب ”سید احمد شہید“ میں رقمطراز ہیں کہ: ”سید صاحب کا نصب العین جہاد تھا، دہلی میں رہ کر اس کا پروگرام سال بھر میں بنایا اور تجربہ کرنے کے لئے دورے کا منصوبہ گانٹھا، جب مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنے لگے تو شاہ صاحب سے دورے کی اجازت لی۔۔۔ شاہ صاحب نے خطوط بھی لکھ دیئے کہ یہ ہمارے ہیں ان کی تو وضع کرنا، یہ دورہ شاہ صاحب کے مشورے سے ہوا تھا۔“

یہ دورہ تبلیغی تھا، سید صاحب کے دماغ میں بھی جہاد کا وہم نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا، وہ اس لغت سے بھی واقف نہیں تھے، اگر یہ کہا جاتا کہ ان دوروں کا مفہوم شاہ اسماعیل کے دماغ میں جہاد تھا تو اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو بھی تکلف نہ ہوتا، کیونکہ شاہ اسماعیل ریڈیڈنٹ کے اشارہ پر سکھوں کے مظالم کو دیکھ آئے تھے اور سید صاحب کے دہلی آنے سے قبل جہاد کا تہیہ کر چکے تھے، مگر سید صاحب کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے کچھ دن کے لئے فراموش کر چکے تھے اور کفران نعمت کی بہترین مثال اس بلاغت اور شاعری کے کمال سے ظاہر ہوتی ہے جو جناب مہر نے یہ ظاہر کی ہے کہ:

”لیکن شاہ صاحب کے خطوط شناسائی کا ذریعہ تھے نہ کہ تبلیغ و اشاعت کے۔“

اب اگر اس شاعری پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دورے میں تبلیغ و اشاعت کا سہرا مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل کے سر ہے، سید صاحب غریب نہ وعظ فرما سکتے تھے اور نہ تقریر کر سکتے تھے، سید صاحب کی روحانیت کو مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل جیسے عالموں کی ضرورت تھی اور ان دونوں صاحبان کی علمیت سید صاحب کی روحانیت کی محتاج تھی، پہلے ہی قدم پر اتنی روشنی پھیلی کہ شاہ صاحب کے حلقہ اثر میں دہلی سے لے کر پٹنہ اور کلکتہ کے زمین و آسمان چمک اٹھے، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بھی تصور تھا کہ سید صاحب کی روحانیت سے شاہ اسماعیل اپنی لغویات سے باز آسکیں گے، یہ دورہ محض تبلیغی تھا، اس دورے میں سید صاحب کی سیادت و قیادت کا عام طور پر چہ چارہا، اور سید صاحب خود بھی اپنی امامت و برتری کے مدعی تھے، سوانح احمدی کے مکتوب نمبر ۵۷ سے جو وزیر الدولہ کے نام ہے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ دعویٰ امامت میں نے خود نہیں کیا بلکہ غائب سے ہدایت ہوئی ہے اور اس کا اظہار کرنے پر مامور ہوں، اس میں کسی قسم کے کذب کا دخل نہیں ہے، معتقدین کا دعویٰ و اعلان ہے کہ سید صاحب پیدائشی طور پر ولایت انبیاء کے حامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ مامور من اللہ، مہدی زمان اور مسیح موعود بھی تھے۔ فدائی ابن تیمیہ کی طرح ان



اوصاف سے متصف کرتے تھے، اسی وجہ سے سید صاحب کی بیعت و خلافت کو خبط کر کے ان کے مختار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، پھر امام تو سمجھتے ہی ہیں، حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو امام ربانی اور مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے، وہ بھی جبلی طور پر روحانیت رکھتے تھے، مگر انہیں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت و خلافت کا نہ صرف اقرار ہے بلکہ نازاں بھی ہیں، جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر و ثابت ہے، غالباً سید صاحب کے یہ فدائی ابن تیمیہ کی تقلید میں بغیر حصول خلافت کے اور عدم وجوب تقلید کے قائل ہیں لیکن بایں ہمہ ان کی ظاہری طور پر بیعت کا عجیب انداز سے اقرار ہے، اگر کسی طرح عربی گھوڑا اور اسپ تازی لاکھ اصیل و ذہین ہو اور قدرت کی طرف سے خاص عطیات بھی اسے ملے ہوں، مگر وہ بھی تربیت اور کاڑھے جانے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن تربیت پانے کے بعد بھی اس میں چوگان بازی، پولو کھیلنے اور میخ بازی کی اہمیت و قابلیت نہیں پیدا ہوتی، لہذا اس کی اسے مزید تعلیم و تربیت دی جانی ہے، یہ بات کے منکر غالباً کمزور حافظہ رکھتے ہیں، ان کے بیانات سے خود ان کی خلافت کا اظہار ہو جاتا ہے، جب شاہ اسماعیل، سید صاحب کے مرید ہو گئے تو شاہ عبدالعزیز نے مصلحتاً ان سے سید صاحب کے کمالات کے متعلق استفسار کیا، شاہ اسماعیل کا جواب ”سوانح احمدی“ کے صفحہ ایک سو بیس اور مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ”سید احمد شہید“ کے صفحہ ایک سو اٹھارہ پر محفوظ ہے کہ ”سید صاحب“ پر پروردگار عالم کی نظر کرم ہے اور یہ سب آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو علم مرحمت فرمائے ہیں، علم ظاہری سے شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ فیض یاب ہوئے اور علم باطنی کے حامل سید صاحب ٹھہرے۔“

اب رہا دعویٰ مہدیت تو اس پر امتداد زمانہ نے پردہ ڈال دیا ہے، اور دعویٰ غیبت بھی آج صرف غلطی کی طرح غائب ہو گیا ہے، امامت کے متعلق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شاہ اسماعیل کے علم معقول سے زیر رہی لیکن باوجود ان بدیہی مشاہدات کے ان کے پرستاروں کی آنکھ نہیں کھلتی کہ ان کی اصلی اور واقعی عظمت کو گندگی میں مبتلا نہ کریں، اسے کہتے ہیں اندھی تقلید، تقلید کے منکر اندھی تقلید کے قائل ہیں، لیکن سول یہ ہے کہ نو

ایجاد سلسلہ محمدیہ کا آج کہیں نام و نشان بھی ہے؟

۱۔ شاہ صاحب سید صاحب کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ خاندان مجددی ”نسبت (۱) آدمی بسوئے خدا کے نام سے جو نسبت“ ہے وہ ان کو کرامت ہوئی ہے، دہلی میں بہت سے آدمی ان سے منافع ہوتے تھے۔

۲۔ سید احمد بریلوی سے فرمایا کہ دنیا بکھیرے کی جگہ ہے، اگر خالص اللہ کے لئے اس سے کچھ حاصل جائے تو بہتر ہے۔ (اور اسی کی سید صاحب نے پرواہ نہیں کی) مختلف تذکروں میں سوانح نویسوں نے صحیح یا غلط جو کچھ بھی لکھا ہے وہی پیش نظر ہے اور اسی پر یہاں بحث کی گئی ہے، بعض سوانح نگار شاہ محمد اسحاق کو سید صاحب کے چندہ جمع کرنے کا منصب عطا کرتے ہیں، خصوصاً جناب مہر صاحب، لہذا اس کو تنگ نظری یا حسد ہی کہا جاسکتا ہے۔

قصہ مختصر سوائے جناب مہر کے ہر تذکرہ نویس کو اقرار ہے کہ شاہ صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ ”بطور خود آس پاس کے شہروں کا دورہ کریں“، چنانچہ ان کے ہی حکم کے مطابق دورہ کیا گیا اور ان ہی کی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق خالص طور پر دعوتوں اور تبلیغ کا دورہ کرنے کے لئے مختلف مقامات پر اعلان و اشتہار دینے کی غرض سے اور چندہ جمع کرنے کے لئے سفیر بھیجے گئے، چنانچہ منجملہ دیگر حضرات کے شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور مولوی محمد یوسف کو انہوں نے ہی سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں سے دعوت نامے آنا شروع ہوئے، پھر شاہ صاحب نے ہر جگہ تعارف کے خط لکھے کہ ”یہ ہمارے ہی آدمی ہیں“ (سوانح احمدی، وحیات طیبہ) (۲)

معلوم نہیں سید صاحب کے تذکرہ نویس کتنے چلیں بہ جس میں ہوں گے، اگر سفارش و تعارف کے ساتھ وسیلہ کا بھی اضافہ کر دیا جائے، کیونکہ یہ سب الفاظ مترادف

۱۔ یہ الفاظ تحریف شدہ ہیں یا سہو کا تب ہیں۔

۲۔ کسی نوعیت سے شاہ عبد العزیز کی تحریر تقریر میں اس قسم کی روایتوں کی سند نہیں ملتی، اسی واسطے ان کا احکامات کے متعلق تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف بھی ہے، بہتر ہوتا کہ شاہ عبد العزیز کو معاف کر دیا جاتا اور ان کو شامل نہ کیا جاتا۔

ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ خاندان ولی اللہی کی نسبت اور شاہ عبدالعزیز کی ہرول عزیز کی اور تعلیم بھی سید صاحب کی شہرت کا سنگ بنیاد بنی ورنہ بے بود در سیستان۔

ابھی دو آہ کے دورے کی تیاری ہو ہی رہی تھی کہ سید صاحب کی بازیافت کی خبر اتنے زمانہ کے بعد ان کے بڑے بھائی کو ہوئی اور سید محمد اسحاق صاحب (۱) ان کو وطن لے جانے کے لئے بے تابانہ طور پر دہلی آگئے، لیکن سید صاحب کی مشغولیتوں اور شان و شوکت کو دیکھ کر انہوں نے مناسب سمجھا کہ ان امور سے فارغ ہو کر سید صاحب وطن آئیں۔ اور اٹنے قدم واپس چلے گئے۔ وطن والوں کو فخر و مسرت کے ساتھ سید صاحب کے حالات سے آگاہ کیا اور وہ سب ذوق و شوق کے ساتھ سید صاحب کی مراجعت کے لئے دعائیں مانگنے لگے، سید صاحب کا یہ دورہ تبلیغ جس میں جہاد کا کوئی ذکر نہ تھا، اپنی قسم کا عجیب و غریب دورہ تھا، شاہ عبدالعزیز کا دو آہ میں بے حد اثر تھا، ان کے مریدوں، شاگردوں اور رشتہ داروں نے جی اور جان سے ان کا استقبال کیا، بیس تیس رفیق جلو میں ہوتے تھے اور بعد اس جماعت کی تعداد سو سو تک پہنچ گئی تھی، اتنی بڑی جماعت کے ساتھ گھر گھر جانا بذات خود مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا، ہر جگہ وعظ فرمائے جاتے تھے، مذہبی اصول سمجھائے جاتے تھے اور نذرانے لئے جاتے تھے، شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی، سید صاحب کی پاکی کے ڈنڈے تمام کر مسلسل پیدل چلا کرتے تھے، یہ گشت بھلت، مظفر نگر، لہاری، سہانپور، دیوبند اور نانوتہ وغیرہ میں ہوا تھا، اس کی مدت چھ ماہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جتنی مقبولیت یہاں حاصل ہوئی اتنی کسی اور جگہ نہیں ہوئی، عام خیال تھا کہ تاریکی چھٹ جائے گی، کچھن دور ہو جائیں گے، نحوست مٹ جائے گی، ادبار جاتا رہے گا، چاند نکل آئے گا۔

راپور کے دورے میں ایک حکیم عطاء اللہ خان نائب وزیر راپور نے خود سید صاحب سے ان کے ”طریقہ محمدیہ“ کے متعلق استفسار کیا تھا اور سید صاحب نے خود اپنی زبان مبارک سے بالتفصیل اور طول و طویل وعظ کی صورت میں تشریح

۱۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا تھا۔

فرمائی تھی، جس کا لب لباب یہ ہے کہ پہلے جملہ سلاسل صوفیہ میں بیعت لینے کے بعد اپنے ”طریقہ محمدیہ“ میں بیعت اس لئے لیتا ہوں کہ دوسرے طریقوں میں رسول ﷺ کا تعلق بطور باطن کے ہے اور ”طریقہ محمدیہ“ میں بطور ظاہر کے اور اس کے فضائل بتائے ہیں، گویا سید صاحب رسول سے ظاہری تعلق رکھنے کو باطنی تعلق پر ترجیح دیتے ہیں اور لازمی سمجھتے ہیں، یہ وعظ اور تشریح سن کر حکیم صاحب مطمئن ہو گئے، شاید حکیم صاحب محض قارورہ دیکھ کر جو ظاہری شے ہے، علاج کیا کرتے تھے اور نبض سے انہیں تشخیص کرنا نہیں آتی تھی کیونکہ یہ باطنی چیز ہے، اسی وجہ سے مطمئن ہو گئے ورنہ وہ یقیناً ایسی مبہم بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتے، آخر انہوں نے سید صاحب سے کیوں نہیں دریافت کیا کہ آپ کی پوری کائنات علم لدنی پر ہے جو باطنی خوبی ہے اور ظاہری علم یعنی شریعت کے متعلق آپ کو پوری دستگاہ نہیں ہے، اس لئے اپنی خصوصیات کے مطابق آپ کو رسول سے باطنی تعلق و نسبت رکھنے کی تلقین کرنا چاہیے تھی، مگر جو وعظ ارشاد فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا، ممکن ہے کہ اپنے آپ کو ملا متیہ ظاہر کرنے کے لئے ایسا وعظ فرمایا ہو، یا پھر اس کی وجہ ظاہری یہ ہو کہ سب سے زیادہ وہ انگریزوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور انگریز اسلام کو محمد بن ازم کہا کرتے ہیں، لہذا ان کی خوشی کی خاطر انہوں نے ظاہر پرستی اختیار کی اور اپنے طریقہ کا نام بہ تقلید انگریز ”طریقہ محمدیہ“ رکھ لیا، اور اگر رامپوری حکیم صاحب کو کچھ بھی شائبہ علم شریعت و طریقت ہوتا تو وہ باسانی تردید کر سکتے تھے کہ شریعت سیڑھی ہے اور اس کے ذریعے چھت پر چڑھا جاتا ہے اور اس چھت کا نام طریقت ہے اور یہی مقصد ہے، لیکن اگر یہ شریعت کی سیڑھی ہوا میں کھڑی ہوئی ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ گر پڑے گی، نماز پڑھنی ضروری ہے، اس کی بہت تاکید ہے، مگر ظاہری رکوع و سجود کا نام نماز نہیں، صاف بتایا گیا ہے کہ نماز بغیر حضور قلب کے قیامت میں منہ پر ماری جائے گی، اور حضور قلب باطنی شے ہے، جو رکوع و سجود کے ذریعہ قلب و دماغ کو متاثر کر کے حاصل کیا جاتا

ہے۔ لہذا باطنی نسبت کو مقدم کر کے ظاہری نسبت کو مؤخر کر دینا۔ اور باطنی نسبت کو ظاہری نسبت کے مقابل میں کم درجہ سمجھنا مومن کا کام نہیں ہے۔ بغیر انجام کا خیال کئے ہوئے محض آغاز پر قناعت کر لینا صحیح نہیں۔ جدت کے رسیا ہونے کی وجہ سے کہ بدنام بھی ہو گئے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہ اسمعیل ہی کہہ سکتے تھے۔ سید صاحب سے ممکن نہ تھا۔ یہ اتہام ہے سید صاحب سے ان کی منسوب کرنا بدترین ظلم و فسق ہے۔

قیام سہارنپور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو مختلف نوعیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ۔۔۔۔۔ ”سہارنپور میں ایک مسجد بونی والی کے نام سے مشہور تھی۔ سید صاحب اس مسجد کے پاس سے گذر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹکے۔ دریافت فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ جی ہاں، سید صاحب مسجد میں جا کر ان سے ملے۔ اور اس کے بعد عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔ کہتے ہیں کہ بونی والی مسجد میں جو صاحب رہتے تھے ان کا نام شاہ عبدالرحیم ولایتی تھا۔۔۔۔۔ امر وہ پہنچ کر حضرت شاہ عبدالباری سے مرید ہوئے اور ان کی تعلیم و تربیت سے مستفید ہوئی رہے تھے کہ شاہ عبدالباری کا بھی انتقال ہو گیا اور خلافت کی سند نہ مل سکی۔ سہارنپور میں آ کر بونی والی مسجد میں قیام فرمایا تھا کہ ایک دولت بیدار خود ان کے سر ہانے آ گئی۔ یعنی سید احمد شہید ان کے پاس ملنے آ گئے ملنے کے ساتھ خلوت ہو گئی۔ پھر باطنی قسم کے بڑے قصبے درمیان میں پیش آئے۔ آخری نتیجہ یہ تھا کہ دو پیروں سے مرید اور باضابطہ تعلیم پانے کے بعد سید شہید کے دست حق پرست پر شاہ عبدالرحیم نے بیعت فرمائی۔ اور اجازت بھی ان کو سید صاحب سے حاصل ہوئی۔ ارواحِ ثلاثہ میں حکیم الامت تھانوی کی روایت ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف ہو کر کیفیات و نسبت کا مبادلہ کرتے تھے۔ ص ۱۲۵، اور میر شاہ خان کا بیان مولانا توتوی کی زبانی یہ ہے کہ:



آخر میں شاہ عبدالرحیم پر سید صاحب کی نسبت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ ص ۱۲۶، مشائخ دیوبند کے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کے مرشد برحق میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے پیر یہی حضرت عبدالرحیم ولایتی ہیں۔ جن پر سید احمد شہید کی نسبت کا غلبہ بقول نانوتوی ہو گیا تھا۔۔۔ ایک طرف۔۔۔ سید احمد شہید کی خدمت میں میاں جی نے عرض کیا کہ میں ذکر و شغل حضرات قادر یہ و چشتیہ کر چکا ہوں، (ارواح ثلاثہ) اور دوسری طرف سید احمد شہید سے آپ کوئی چیز کیا ملی تو فرمایا سید صاحب کی برکت سے نماز پڑھنا آگئی اور روزہ رکھنا آگیا۔ ص ۱۲۵۔ یعنی باطن کے ساتھ ظاہر کی تکمیل ہو گئی۔

”سوانح احمدی“ میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ سید احمد شہید کے خلفائے اعظم میں حاجی عبدالرحیم کا نام لکھ دیا ہے۔ ”سیرت سید احمد شہید“ میں حاجی عبدالرحیم اپنی خلافت سے دستبردار ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پہلی نسبت کی کمزوریاں بتاتے ہیں اور نئی نسبت و خلافت کا اقرار کرتے ہیں۔ یعنی وہ بقول خود سید صاحب کی خلافت پر نازاں ہیں۔ گویا صابری نسبت کو انہوں نے ترک کر دیا۔ جناب مہر صاحب نے بھی اسی حقیقت کے متعلق نہایت لطف کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

”سہارنپور میں سید صاحب مسجد بونبی میں ٹھہرے تھے۔ وہیں حاجی عبدالرحیم ولایتی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے پیر مانے جاتے تھے۔ (۱) سید صاحب کو دیکھا تو خود بیعت کی۔ اور مریدوں کو بھی بیعت کا حکم دیا۔ فرمایا کرتے تھے: ہمیں نماز پڑھنی آتی تھی نہ روزہ رکھنا آتا تھا۔ سید صاحب کی برکت سے ہم دونوں کام سیکھ گئے۔

حقیقت کچھ ہی ہو مگر ان بیانات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ حضرات اپنا

۱۔ جب خلاف نہیں ملی تھی تو پیر کیسے ہو گئے، چونکہ پیر وہ نہیں تھے اس لئے ان کے مرید بھی نہیں تھے۔

سلسلہ مخدوم صاحب سے ملاتے ہیں، وہ غلط ہے اور ان کو ان شہادتوں کی بنا پر اپنے آپ کو سید احمدی کہنا چاہیے۔ روایتوں میں عبدالرحیم کا نام ہے مگر اس نام کے اس زمانہ میں دو شخص تھے۔ ایک عبدالرحیم کاندھلوی اور دوسرے عبدالرحیم ولایتی۔ ان روایتوں میں عبدالرحیم کی شخصیت کا متعین نہ ہونا امیر حمزہ کی داستان بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب سے مغلوب ہو جانے والے عبدالرحیم کاندھلوی ہوں۔ واللہ اعلم۔۔۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ عبدالرحیم ولایتی جہاد میں شریک تھے اور وہیں شہادت نصیب ہوئی۔ یہ برہنہ فتویٰ شریک جہاد ہوئے تھے۔

جناب مہر صاحب کی تحقیق اینق ہے کہ دورہ ختم کر کے جب دہلی واپس آئے تو اپنے بھائی سید محمد اسحاق کے انتقال کی خبر سنی، اس لئے وطن جانے کے لئے مجبور ہو گئے، بقیہ تذکرے متفق البیان ہیں کہ بڑے بھائی کے انتقال کی خبر سہارنپور کے قصبہ منہاراں میں سنی تھی اور وہیں سے ساٹھ ستر رفیقوں کو ساتھ لے کر سیدھے وطن چلے گئے تھے۔ اثنائے راہ میں مختلف مقامات گڈھ مکتیشر امر وہہ اور مراد آباد میں تبلیغ کرتے ہوئے ریاست رامپور پہنچے۔ وہاں کچھ دن قیام کیا۔ یہاں ایک افغانی نے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی درد انگیز طریقہ سے داستان سنائی، اس ریاست پر انگریزوں کا اثر ہو چکا تھا۔ بھائی کے انتقال کا صدمہ تو تھا ہی مگر اس غیر محض افغانی کا بیان سن کر دل دہل گیا۔ پھر بانس بریلی (۱) وغیرہ میں تنظیم و تبلیغ کے جلسے کرتے ہوئے شعبان ۱۲۳۴ھ کی چاند رات کو مطابق ۲۳ جون ۱۸۱۹ء دس سال کی فراری و غیر حاضری کے بعد وطن مالوف رائے بریلی تشریف فرما ہوئے، یہاں چھبیس ماہ قیام کیا۔ یعنی ۲۳ اگست ۱۸۲۱ء تک تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ طعام و قیام کا انتظام پوری جماعت کا بفضلہ تعالیٰ بخیر و خوبی ہوا۔ اہل وطن کے اختلافات دور کئے۔ سب میں صلح کروائی۔ اعتقاد کی درستی میں خاص سعی کی۔ شرک کے معنی سمجھائے (جن سے

۱۔ بانس بریلی سے خاوشی سے گزر گئے اور تبلیغ نہیں فرمائی، اہل حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب اور حضرت شاہ نیاز احمد کچھ نہ کچھ تو اس کی بابت لکھتے۔

وہابیوں کے شرک کی تائید منظور نہیں تھی۔) بدعتوں کی تردید کی اور معاشرہ کی اصلاح فرمائی۔ تعزیوں کے جلوس کے متعلق قریب کے قصبہ نصیر آباد میں شیعہ سنی اختلاف کو دور کروانا چاہا۔ صلح نہ ہو سکی مگر جلوس نہیں نکلا۔ مجتہد صاحب نے لکھنؤ جا کر حکومت سے شکایت کی۔ اس پر سید صاحب کی طلبی ہوئی۔ لکھنؤ مجرم بن کر گئے تھے۔ مگر لکھنؤ سے فاج بن کر لوٹے۔ اس مرتبہ بھی یہاں کی کورنش اور تسلیمات پر معترض نہیں ہوئے۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ لکھنؤ والوں کے تکلفات اور نمائشی اصولوں سے سید صاحب کی سادگی مات کھا گئی۔ جب لکھنؤ والوں کی تہذیب کو گوارا کر لیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قبولیت عامہ نہ ہوتی، لکھنؤ سے واپس آ کر جب دیکھا کہ نکاح بیوگاں کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو نمونہ اور مثال قائم کرنے کے لئے اپنے بڑے بھائی سید محمد اسحاق کی بیوہ سے خود نکاح کر لیا۔ پتا نہیں کہ زوجہ اولیٰ موجود تھیں یا نہیں۔ پھر تو یہ ہندوانہ رسم غائب ہو گئی۔ اس سلسلہ میں تذکرۃ الرشید کی روایت دلچسپ ہے۔ یعنی بعد نکاح ثانی سید صاحب کی نماز فجر قضا ہونے لگی اور جماعت چھوٹ گئی۔ آخر کار مولانا عبدالحی نے فرمایا کہ اب عبادت الہی ہو گئی یا شادی کی عشرت منائی جائے گی۔ سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ پھر نماز فجر باجماعت ہونے لگی۔ (۱) ”سوانح احمدی“ اور ”سیرت سید احمد شہید“ میں یہ روایت ہے کہ سید صاحب غوطہ مار کر دو رکعت نماز پانی کے اندر پڑھ لیتے تھے۔ اسی زمانہ میں گویا ۱۸۲۰ء میں صراط مستقیم منصہ وجود میں آئی (۲)۔ کہتے ہیں کہ سید صاحب اپنا مفہوم بتا دیتے تھے اور شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی اپنے اپنے مطابق پورا مضمون لکھ دیتے تھے۔ صراط مستقیم نے تقویۃ الایمان کو منسوخ کر دیا ہے۔

اب یہاں کی بستی میں مختلف مقامات سے آ کر جمع ہونے والے معتقدین کی تعداد چار سو کے قریب پہنچ گئی تھی۔ رامپور میں افغانی کا بیان سن کر قلب کے اندر پھانس چبھ گئی تھی۔ سال دو سال میں اپنی مقبولیت دیکھ کر طے کیا کہ کار تبلیغ اتمام کو پہنچ گیا۔ اب قلوب کو جہاد کی طرف نگانا چاہیے۔ شاہ عبدالعزیز کو اس ارادہ کی

۱۔ اب معتقدین اس روایت کو الحاقی بتاتے ہیں۔

۲۔ صراط مستقیم ۱۸۲۲ء میں کلکتہ میں چھاپی گئی تھی جبکہ سید صاحب حج کو گئے ہیں ۱۸۱۸ء والی روایت غلط ہے۔

خبر نہیں کی گئی۔ جب جہاد کا ارادہ طے ہو گیا تو کچھ دن بعد اپنے طریقہ محمدی کے اصول پر اعلان کیا گیا کہ ورد و وظائف ترک کئے جائیں۔ عزت نشینی کا حاصل کچھ نہیں۔ فنون جنگ پر طبع آزمائی کی جائے۔ روحانیت کو جنگ کی مشقوں سے زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی دم مار سکتا۔ مگر ہر شخص دم بخود تھا۔ مولانا مہر کی روایت کے مطابق عبدالرحیم کاندھلوی کی وساطت سے لوگوں نے اس مژدہ کے معنی سمجھنے چاہے۔ سید صاحب نے یہ فرما کر کہ مجاہد کا درجہ عابد سے افضل ہے سب کو مطمئن کر دیا گیا۔ اس کے برخلاف سیرت سید احمد شہید کا یہ بیان ہے کہ مولوی محمد یوسف کے استفسار پر یہی توجیہ بتا کر کہا تھا کہ اب بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ شاہ عبدالرحیم ولایتی سے اپنا اطمینان کر لے۔ یہ عبدالرحیم ولایتی شاہ عبدالباری امر وہوی کے سلسلہ صابر یہ میں خلیفہ تھے، مگر وہ سلسلہ صابر یہ کو ترک کر کے حسب روایت ”سوانح قاسمی“ و ”تذکرۃ الرشید“ سید صاحب کے خلیفہ بن گئے تھے۔ جب ولایتی صاحب سے لوگوں نے سید صاحب کے اس نئے حکم کا مطلب سمجھنا چاہا تو انہوں نے سید صاحب سے اپنی بیعت کا ماجرا بتایا۔ پھر سمجھایا کہ گھاس کھودنے، لکڑی کاٹنے، مٹی ڈھونے، دیوار بنانے اور جسمانی محنت کرنے سے میری مادیت زائل ہو گئی۔ اور روحانیت بڑھ گئی۔ یہ بھی بتایا کہ اگر میں اپنی پرانی حالت میں مرجاتا تو میری نجات نہیں ہوتی، مگر مہر صاحب نے اس سے بہتر توجیہ لکھی ہے۔ گویا تنقیہ کے بعد یہ نسخہ تجویز کیا گیا تھا۔ بہر حال اس نئے حکم کے بعد بجائے تسبیح کے یہاں ہر ایک ہاتھ میں تیر و تنگ نظر آنے لگے۔ مصلے پر بیٹھنے کے بجائے ہر شخص کبڑی کے کھیل میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح روحانیت میں بے حد و بے قیاس ترقی ہوئی۔ جب جسمانی مشقت سے روحانی معراج حاصل ہو گئی تو ایک نیا مکان اور دو نئی مسجدیں تعمیر کروائی گئیں۔ اب جو دورہ کیا جاتا تھا تو ایک سوستر غازی ساتھ میں ہوتے تھے۔ چنانچہ فوجی قواعد کے ساتھ سلون، کانپور، الہ آباد، بنارس اور سلطانی پور وغیرہ کا دورہ کیا گیا۔

بنارس میں آگسٹس بروک کی طوائف حیات النساء نے بیعت کی، مگر اس کی بیعت کا واقعہ سفر حج کا ہے۔ بہر حال بنارس میں اس نے سات ہزار روپیہ کی رقم نذر کی تھی جس کو سید صاحب نے حرام ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس کے مختار عام نے اس رقم کو تجارت میں لگایا، اور منافع کثیر پیدا کیا جو سید صاحب کی روانگی حج کے موقع پر نذر کیا۔ اور انہوں نے قبول فرمایا۔ شاید حرام اس رقم کو اس لئے سمجھا تھا کہ حیات النساء مغل نہیں بلکہ کسی تھی اور اس انگریز کے یہاں مدخولہ کی طرح رہتی تھی۔ حرام کمائی کا منافع جائز ہو جانا ایک نیا مسئلہ ہے، مگر جناب مہر صاحب کا خیال ہے کہ:-

”جہاد کے غلبہ و جوش کی داستان سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے ورنہ

جہاد تو پہلے ہی سے ان کی سرشت میں داخل تھا۔“

لیکن بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بقول ”حیات طیبہ“ شاہ اسماعیل سکھوں سے جہاد کا تہیہ سید صاحب کے دہلی آنے سے پیشتر اپنے قلب میں رکھتے تھے۔ اس لئے مہر صاحب کا خیال خود ان کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اور یہ جہاد کسی کے بھی تخیل کا کرشمہ ہو۔ مگر عقل سلیم ہنستی ہے۔ بغیر سامان جہاد مٹھی بھر آدمیوں کے سہارے انگریزوں یا سکھوں سے جہاد کرنا خود مضحکہ خیز ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بر بنائے قوت ایمانی یہ ارادہ کیا تھا تو اس کا ثبوت دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے:

”عمل جہاد کو انجام دینے کے لئے اس کے اسباب و لوازم کا مہیا کرنا بھی

از بس ضروری ہے“۔ (ترجمہ حجۃ اللہ الباقی ص ۶۹۱)

یہ صحیح ہے کہ بچپن میں سید صاحب ہوائی نہیں بلکہ ریتے کے قلعے بناتے تھے اور توڑتے تھے اور اگر یہی بنائے جہاد ہے تو کون ایسا بچہ ہے جو ایسے کھیل نہیں کھیلا کرتا۔ اور اس کو مجاہد و غازی نہیں کہا جاسکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۰۸ء میں رنجیت

سنگھ نے سکھوں کی حکومت قائم کی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں پر ستم ڈھائے، دہلی کے ریڈیڈنٹ سے ۱۸۰۹ء یا ۱۸۱۰ء میں اشارہ پا کر شاہ اسماعیل نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا تھا اور اس کے بعد جہاد کا تصور جمایا تھا۔ جس زمانہ مالوہ سے سید صاحب دہلی آئے تھے، وہ جہاد تو جہاد سکھوں کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ البتہ جب رامپور میں افغانی نے سکھوں کا نام سنایا اور ان کے مظالم بتائے تو سید صاحب متاثر ہوئے اور شاہ اسماعیل کو اپنا بھولا ہوا خواب یاد آ گیا۔ پھر تو شاہ اسماعیل سید صاحب کو جہاد کی ترغیب دینے لگے۔ برابر تقاضے کرتے رہے اور مختلف پہلو دکھاتے ہوئے انہیں راہ پر لگا لائے۔ ماہی حاصل یہ ہے کہ اصلی تخیل جہاد شاہ اسماعیل کا تھا۔ چونکہ سید صاحب کو سردار بنا لیا تھا، اس لئے جہاد کا سہرا ان کے ہی سر باندھ دیا۔ گویا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی سید برادرز کی طرح یہاں ولی گر بن گئے۔

جہاد کی تبلیغ کے ان دوروں کے بعد حکومت اودھ کے نواب معتمد الدولہ نے کسی نامعلوم وجہ سے سید صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ سید صاحب مع خدم و حشم دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔ اس مرتبہ علمائے لکھنؤ اور شاہ اسماعیل سے حج کے ساقط ہونے پر بحث ہوئی۔ اور فریقین نے راہ کے خطروں کی وجہ سے حج کے ترک کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فتوے لکھے اور ان فتوؤں کو فشی خیر الدین لکھنوی نے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں فیصلہ کے لئے بھیج دیا۔ ان کا فیصلہ شاہ اسماعیل کے حق میں ہوا۔ ان مباحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معشوق تھا اس پردہ زنگاری میں۔ اور مسئلہ حج پر اس خاص وقت میں بحث کروانے کا کچھ منشا بھی تھا۔ اب اس مناظرے اور فتوؤں کی وجہ سے سید صاحب نے پلٹا کھایا کہ خطرات راہ کی وجہ سے حج کے ترک کرنے کا جو رجحان پیدا ہو رہا ہے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ لہذا قصد جہاد کو منسوخ کر کے حج کرنے کا تصور جمایا۔ (۱) شاید اس زمانہ میں سکھوں اور انگریزوں میں مزید راہ و رسم پیدا ہونے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ ریاست رامپور میں افغانی کی داستان سن کر جہاد کا تصور بندھا تھا۔ اب ریاست اودھ میں حج کا تصور بندھا اور سمجھایا گیا کہ محض



ہندوستانی مسلمانوں سے سکھ مار کھانے والے نہیں ہیں۔ اس لئے بیت اللہ جا کر سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے عالم اسلامی کی حمایت حاصل کر لینا چاہیے۔

اس سفر لکھنؤ میں ایک اور نعمت ہاتھ لگی یعنی مولوی اشرف علی لکھنوی کے شاگرد مولانا ولایت علی عظیم آبادی بڑے دم خم سے مباحثہ کرنے آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رام ہو کر نہ صرف حلقہ بگوش ہوئے۔ بلکہ سید صاحب کے ساتھ بھی ہوئے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد کالے پانی میں سید صاحب کے دوبارہ تشریف لانے کا انتظار کرتے ہوئے راہی ملک بقا ہو گئے۔

خدا جانے کونسی بات صحیح ہے۔ بہر حال بنارس یا لکھنؤ کے سفر سے واپسی میں سید صاحب نے معتقدین کو نہایت سادگی سے مطلع کیا، اب ہم حج کو چلیں گے۔ تبدیلی ارادہ کا باعث اللہ ہی جانتا ہے کہ فقہ تھا۔ الہام تھا یا کسی دشمن کا سکھانا تھا۔ بہر حال پردہ زنگاری کی بات ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے متعلق قیاس کر کے کیوں گنہگار بنا جائے۔ مولوی مرتضیٰ علی صاحب کا بیان ہے کہ:

شاہ عبدالعزیز کہا کرتے تھے کہ حج سے سید صاحب جب واپس آئیں گے، تو میں سید صاحب سے بیعت کر لوں گا، لیکن جب وہ واپس آئے تو شاہ صاحب کا وصال ہو چکا تھا۔ اور یہ شرف ان کو نصیب نہیں ہوا۔ (سوانح احمدی) مگر تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ صاحب کا وصال ان کے واپس آنے کے بعد ہوا ہے۔ غالباً حافظہ ضعیف ہو جانے کی وجہ سے مرتضیٰ صاحب کو سہو ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۔ کاش اس قسم کے مسائل سے خود واقف ہوتے اور فتنہ کو سمجھتے۔

marfat.com

Marfat.com

## حج

جہاد کی راہ میں قدم اٹھنے ہی والا تھا کہ حج کا اعلان فرما دیا گیا۔ جہاد کے التوا کے اسباب جو بتائے گئے ہیں، ان کا شخص یہ ہے:

سوانح احمدی: (محمد جعفر تھانیسری) اعلان بنارس سے واپس آ کر کیا تھا۔ صاحب ”محزن احمدی“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بچپن سے طبیعت میں شوق اعلائے کلمۃ اللہ وانطقاً نارہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا۔ اس واسطے ہر گھڑی جہاد و قتال کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی کو کافر تھی، مگر اس کی مسلمان رعایا سے آزادی اور سرکار انگریزی کی بے رو ریاکی اور بوجہ موجودگی ان حالات ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کے مانع تھے۔ اس واسطے (سکھوں کے مظالم کی وجہ سے) سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا مگر جہاد کا کام آسان نہ تھا۔ آپ نے چاہا کہ جہاد کرنے سے پہلے فرض حج ادا کر لیں، اور بعد ادائے اس فرض کے سکھوں سے جہاد شروع کر دیں۔

سیرت سید احمد شہید (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

محبت و شوق و جذب الہی کا۔۔۔۔۔

مگر صاحب محزن کا بیان بایں الفاظ ”سوانح احمدی“ میں ہے کہ چونکہ انگریزی عدل گستری کی وجہ سے ان سے جہاد کرنا جائز نہیں تھا، لہذا سکھوں سے جو ہارج و مانع مذہب تھے، جہاد کرنے کی ٹھہری اور طے کیا کہ حج پہلے کیا جائے اور سب

مریدوں کو اس کی اطلاع دی گئی۔ مخزن احمدی کی معلومات یقیناً صحیح ہو سکتی ہیں، کیونکہ مصنف سید صاحب کے بڑے بھانجے تھے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے۔۔۔ جناب مہر صاحب رقمطراز ہیں کہ شدید تقاضا تھا کہ حج کو چلئے۔۔۔ سید صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے مردہ سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا فرض کو کس طرح نہ کرتے۔ حج عرصہ سے۔۔۔ متروک ہو گیا تھا۔۔۔ حج جہاد کا مقدمہ بھی ہے۔ سید صاحب نے حج کی تیاری کر دی۔

### حیات طیبہ (مرزا حیرت دہلوی)

ابھی مجاہدین اور روپیہ جمع ہونے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت تھی۔ اس نظریہ سے بہتر سمجھا گیا کہ حج بیت اللہ کر آنا چاہیے جب تک خلفاء چندہ اور آدمی جمع کر رکھیں گے۔

### سید احمد شہید (مولانا غلام رسول مہر)

چنانچہ لکھنؤ سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے رفقاء خاص۔۔۔ کو رائے بریلی سے رخصت فرمادیا کہ اپنے خانگی معاملات سے فراغت حاصل کر لیں۔۔۔ (تا کہ جہاد کے لئے چل سکیں) اس اثناء میں اچانک آپ نے ادائے حج کا ارادہ فرمایا۔۔۔ فرمایا کہ۔۔۔ اب حج کو چلیں گے۔۔۔ حیرت کو دور کرنے کے لئے فرمایا اب مرضی الہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے۔ ”میرے نزدیک اس فیصلہ کی وجہ یہ تھی کہ حج جو متروک ہو گیا ہے اس کو جاری کرنے کی تدبیر یہی تھی کہ خود حج کریں۔“

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم بالا سے تشبیہ ہوئی تھی کہ قصد جہاد قبل از وقت ہے۔ ابھی شرائط پورے نہیں ہوئے ہیں۔ اور وہ شرائط کیا تھے؟ اس کو عالم بالا کے راز دار ہی جان سکتے ہیں اور وہ کون ہیں؟ کہ کسی کو نہیں معلوم۔ یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے تنظیم و تبلیغ سے منہ پھیر کر جہاد کا فوری ارادہ کیا تھا۔ غالباً اس میں بھی بالائی

اشارہ تھا، اور اس اشارہ کی تائید و تصدیق شاہ اسماعیل نے کی تھی۔ اب لکھنؤ کے مناظرے اور شاہ عبدالعزیز کے فیصلہ کے اثر سے سقم محسوس کیا اور اس کو مرضی الہی سے موسوم کیا۔ ظاہر ہے کہ شاہ اسماعیل ہی کی معرفت دونوں مرتبہ مرضی الہی کا علم ہوا۔ بہر حال وجہ کچھ ہی ہو جب حج کے متعلق رائے قائم کر لی گئی تو اعلان بھی کر دیا گیا۔ دعوت نامے بھیجے گئے اور مشتہر کر دیا کہ کل مصارف کے ذمہ دار سید صاحب ہوں گے، جس کا جی چاہے چلے۔ مفت کا حج ہے۔ اس سعادت بزور بازو نیست۔ بغیر اسباب کے اس قسم کا اعلان حیرت زا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسباب نہ ہونے کی وجہ سے ارادۂ جہاد فسخ کیا گیا تھا۔ اس کو کرامت ہی کہا جاسکتا ہے اور کرامت کے متعلق کسی کو حق نہیں کہ چون و چرا کرے۔ اعلان کے ہوتے ہی ہزاروں کا چندہ اور عازمین کا اجتماع ہو گیا۔ جب زائرین کی تعداد چار سو ہو گئی تو ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۲ء میں بقول مولانا مہر صاحب:

”شوال کی آخری تاریخ کو یا بروایت دیگر اہل بعد نماز عید یکم شوال کو یہ قافلہ رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ اور ساڑھے چار ماہ بعد چندہ اور آدمی جمع کرتا ہوا صفر ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۲ء میں کلکتہ پہنچ گیا۔ بندرگاہ بمبئی سفر حج کے لئے آسان مناسب تھی اور بقول مرزا حیرت بیہاں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے اور جناب مہر صاحب وغیرہ کی تحقیق ہے کہ کلکتہ سے جہاز لئے تھے۔ کثرت رائے کی وجہ سے یہی بات معتبر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں کئی بھید ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلکتہ میں مسلمانوں کو انگریزوں نے دبا کر پست کر دیا تھا۔ لہذا مسلمانوں کو مراعات دلوانا تھیں۔ پھر یہاں شاہ عبدالعزیز کے مریدوں اور شاگردوں کی کثرت تھی، اور حاجی شریعت اللہ نے بھی مسلمانوں کی بہتری کے لئے ہندوستان کے دارالہرب ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اور اپنے جھنڈے کے نیچے بہت سے غازی مشرقی بنگال میں جمع کر لئے تھے۔ لہذا ان سے مل کر بھی گفت و شنید کرنا تھی۔

اثنائے راہ میں جن جن مقامات میں قیام فرمایا (۱) وہاں دل کھول کر لوگوں نے استقبال کیا، قیاس سے زیادہ فتوحات حاصل ہوئیں اور ہر قیام میں جس جس نے مدارات کی ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کی رسائی انگریزوں کی خدمت میں تھی اور بعض جگہ خود انگریز تاجروں نے بھی خاص طور پر تواضع کی۔ کانپور میں منڈرو صاحب کی میم مرید ہوئی اور سات روز دونوں وقت دعوت کی۔ اور ایک مکان مع سامان نذر کیا تو اسی کو متولیہ بنا دیا۔ کوڑہ جہاں آباد سے جھاوٹ پھنچے، پھر کچھ اور فتح پور ہوتے ہوئے رائے بریلی آئے۔ اور ایک ماہ قیام کیا۔ اب دہلی سے حج کے لئے قافلے آنا شروع ہو گئے۔ غرض مجمع چار سو کا ہو گیا۔ پھر حج کے لئے روانہ ہوئے۔ ڈلمو سے کشتیوں میں چلے، موضع گڑھ میں امام حسین کے نام کے چبوترے کھدوائے اور علموں کو تباہ کیا۔ آگے چل کر ایک انگریز کھانا لایا اور دو گھنٹے حاضر رہ کر چلا گیا۔ یہ نیل کا سودا کرتا تھا۔“

(سوانح احمدی)

بروایت وقائع ”سید صاحب نے وعظ فرمایا“ معلوم نہیں لوگ اس کا مفہوم سمجھے یا نہیں۔ اس لئے کہ سید صاحب کم گو تھے۔ اور ان کی زبان صحیح الفاظ ادا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ موضع گڑھ میں مولوی یار علی نے اس حج پر بحث کی۔ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے انہیں قائل کر دیا۔ چیری کے بعد اوجھنی سے آگے بڑھے، تو ایک انگریز کی مسلمان (مدخولہ کسی) نے دعوت دی، مگر قبول نہیں کی، مگر اس انگریز کی دعوت قبول کر لی۔ الہ آباد میں شیخ غلام علی وغیرہ سے بے حد دولت ملی اور سامان علیحدہ۔ مرزا پور میں ایک طوائف نے بیعت کی۔ شاہ اسماعیل نے اپنی بہن سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھا لو۔ بادل نخواستہ بٹھا لینا پڑا۔ یہاں سے بھی دولت کثیر ملی۔

۱۔ کوڑہ جہاں آباد۔ کچھوہ۔ فتح پور۔ رائے بریلی۔ ڈلمو کانپور۔ دمی دھم۔ ڈگڈگی۔ کھنہ۔ کیا۔ چیری۔ الہ آباد۔ سرسا۔ مرزا پور۔ چنار گڑھ۔ بنارس۔ زمانہ۔ غازی پور۔ باڑا۔ بلیا۔ بکسر۔ چھپرا۔ دانا پور۔ پھلواری شریف۔ عظیم آباد۔ باڑہ۔ موگیہ۔ بھاگلپور۔ راج محل۔ مرشد آباد۔ ہنگلی۔ پرمت۔ شیورام پور اور آخری مقام کلکتہ (سید احمد شہید)

بنارس میں باوجود بارش کے دعوتوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ عید قربان میں گائیں قربان کی گئیں۔ وہاں کے مسلمانوں کے اختلاف کو دور کیا۔ نکو کا چمار کو مسلمان کر کے اس کا نام الہی بخش رکھا۔ تیموری شہزادے بھی سلام کو حاضر ہوئے۔ اگسٹس برکس کی بیوی (۱) (مدخولہ کسی) نے سات ہزار روپیہ نذر کیا جس کو قبول نہیں کیا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کے بعد اس کے مختار عام نے بیگم (یعنی اس کسی) کی اس رقم سے تجارت کی۔ اور اس سے جو کثیر منافع ہوا وہ وقت روانگی جہاز نذر کی، جس کو قبول فرمایا۔ اس لئے کہ اس میں حرام کا شائبہ نہیں رہا تھا۔ زمانہ پہنچ کر سب نے کبڑی کھلی۔ غازی پور میں ایک پیر زادے نے دعوت کی مگر بیعت نہیں کی، چھپرے میں چند طوائفوں نے نذرانہ دیئے، مگر قبول نہیں کئے۔ دانا پور میں شیخ علی جان نے کہا کہ کئی صوفیوں سے میں نے بیعت کی ہے مگر حالت نہیں بدلی، مگر سید صاحب کی بیعت سے تسکین ہوئی۔ پھر تعز یہ خانہ کو مسجد بنایا اور امام باڑہ کو مسافر خانہ میں منتقل کیا۔ جہاد کی رقمیں ان کے پاس جمع تھیں۔ دانا پور میں کسبیاں تائب ہوئیں اور لوگوں سے ان کا نکاح پڑھوا دیا۔ (سوانح احمدی)

میرے استفسار پر ۱۸۶۸ء میں پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت غلام

حسین رحمۃ اللہ علیہ نے جو بتایا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

”سید صاحب یہاں آئے تو شاہ نعمت اللہ قادری کے حجرے میں کئی گھنٹہ قیام فرمایا، ان سے تصوف اور محبت و مودت کی باتیں رہیں، لیکن شاہ اسماعیل نے حضرت شاہ ابوالحسن فردوس سے مراسم محرم کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی، سید صاحب اس گفتگو میں شریک نہیں تھے۔ حضرت قبلہ والدی مرشدی مولانا شاہ سلیمان سے میں نے سنا ہے کہ ان کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا، انگریز چونکہ سکھوں کے خلاف تھے لہذا انہوں نے ان سے بھڑنے کے لئے راستے ملا لئے، سید صاحب کی حیثیت روحانی پیشوا کی سی تھی اور جنگ کی کمان شاہ اسماعیل کے ہاتھ میں تھی۔“

۱۔ سوانح احمدی نے اس کو خاندان تیموریہ کی مالدار حیات النساء بیگم لکھا ہے۔



حضرت قبلہ کو بزرگوں کی نیک نیتی پر شبہ نہیں تھا، ان کی قربانیوں کا ذکر تاثر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، شاہ اسماعیل کو غایت درجہ سید صاحب سے اعتقاد تھا، وہ ان کو معصوم سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ”منصب امامت“ میں ایسے ہی الفاظ لکھے ہیں، دیکھنے والوں کی یہاں یہ رائے تھی کہ سید صاحب نیک آدمی ہیں، مگر اب حیرت انگیز امر یہ ہے کہ سید صاحب کی وفات کے بعد قبعین نے جن میں نہ فقط عوام تھے، بلکہ ذمہ دار علماء بھی تھے، سید صاحب کو امام غائب کا درجہ دے دیا ہے اور یقین رکھتے ہیں کہ عنقریب ظاہر ہو کر پھر جہاد کریں گے، میرے بچپن میں اس شعر کے پڑھنے والے موجود تھے کہ:

کون سی رات آن ملے گا

دن بہت انتظار میں گزرے

عظیم آباد میں مولوی ولایت علی کے والد وغیرہ سے ملے اور انہوں نے بیعت کی۔ مرشد آباد میں بوجہ رفض کوئی ملاقات کو نہیں آیا۔ (سوانح احمدی) شیعوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں، مگر حاکم نے فرقہ وارانہ رقابت سمجھ کر اعتناء نہیں کی۔

ابتداء میں جب قصبہ مجھاون کی مسجد میں ہاتھ غیب نے بشارت دی کہ سب ہمراہیوں کو بخش دیا، پھر غیبی ہاتھ نے مسجد کو اٹھا کر جنت ماویٰ میں داخل کر دیا، بمقام ڈاکو قادر برحق کے وعدے کا اعلان فرمایا کہ ہمارے ساتھی اب اللہ کے مہمان ہیں۔ اور میرے ہاتھ سے لاکھوں کو ہدایت نصیب ہوگی۔ دعائے فتح حرمین بھی مستجاب ہوئی۔ غرض رد بدعات، منع شرک، ترغیب احکام شرعی کے متعلق شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی تلقین فرماتے ہوئے اور سید صاحب مرثوے سنا کر اپنی کرامتوں سے قلوب پر تصدیق کی مہر لگاتے ہوئے مع قافلہ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا:

”اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے فضل سے امید ہے کہ اس شہر میں باربہایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران ہو جائیں گے، کلکتہ میں قیام تین ماہ امین الدین احمد وکیل سرکار کے یہاں رہا۔ یہ وکیل صاحب بڑے مالدار تھے اور عیش سے زندگی بسر کرتے تھے۔ شراب کے عادی تھے اور ایک طوائف سے آشنائی تھی۔ سید صاحب نے ان کے یہاں ممنوعات شرعی دیکھ کر سب سامان پھینکوا دیا، ایک روز وحید الدین کی موجودگی میں امین الدین کی رنڈی آگئی۔ اتفاق سے اسی وقت سید صاحب بھی پہنچ گئے۔ رنڈی کو چھپا دیا گیا۔ اس موقع پر وحید الدین نے کہا کہ مریض مرض اور طبیب حاذق حاضر ہیں، تو سید صاحب نے احسن الحائقین پر وعظ فرمایا۔ وہ کسی جو کوٹھڑی میں بند سن رہی تھی، نیم بسکلی کی طرح تڑپنے لگی، دروازہ کھول کر حاضر خدمت ہوئی اور توبہ کر کے مرید ہو گئی۔ اس کے بعد امین الدین نے بیعت کی تو سید صاحب نے دونوں کا نکاح کروا دیا۔ مگر صاحب ”مخزن احمدی“ نے ذرا فرق سے اس قصہ کو لکھا ہے۔ یعنی جب نوکر نے جام شراب منشی امین الدین کو دیا تو دیکھا کہ سید صاحب دانتوں میں انگلی دبائے موجود ہیں۔ کئی مرتبہ تصور کا یہی واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح شراب سے توبہ کی۔ (سوانح احمدی) بے نکاح بیبیوں کے بھی نکاح کروائے۔ غیر محنتوں کے فتنے کروائے۔ شراب بند کروادی تو شراب کی سب دکانیں بند ہو گئیں۔ ٹیپو کے شہزادوں نے عربی میں گفتگو کی اور سید صاحب نے جواب دے کر قائل کیا۔ کلکتہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک نکلی۔ شب و روز نیاز مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا، دوران قیام میں کلکتہ رشک ارم بن گیا تھا۔ بعض حاسدوں نے انگریزوں سے شکایت کی کہ انگریز کے خلاف جہاد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ انگریزوں نے حاجی جیون کی معرفت اپنے یہاں وعظ فرمانے کی دعوت دی اور شاہ اسماعیل نے جا کر دس ہزار انگریز مرد اور عورتوں (۱) کے مجمع میں وعظ فرمایا، اثر اس قدر ہوا کہ سب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اگرچہ مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ جب نذرانہ پیش کیا تو واپس کر دیا کہ ہم اجرت وعظ نہیں لیا کرتے۔ مولانا مہر نے

۱۔ تاریخ اس تعداد کو گوارا نہیں کر سکتی اور خصوصاً اس لئے کہ ابھی تک انگریز عورتیں ہندوستان میں نہ ہونے کے برابر تھیں، اور انگریز پیشہ ور عورتوں کو ملازم رکھتے تھے۔

انگریزوں کے یہاں اس وعظ کا ذکر نہیں کیا ہے، پھر کلکتہ میں ”سوانح احمدی“ کے مطابق کسی نے شاہ اسماعیل سے سوال کیا تھا کہ انگریزوں سے جہاد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شاہ اسماعیل نے واضح کر دیا کہ ایسی بے روریا اور غیر متعصب سرکار سے کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں (۲)۔ مولانا مہر اس روایت اور ”سوانح احمدی“ کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ اس روایت کو اس لئے مسترد کر دیا کہ مہر صاحب کو تاریخی واقعات اور انگریزوں کے سلوک کا علم ہے اور وہ انگریزی سرکار کو بے روریا غیر متعصب سمجھنے کو غلط سمجھتے ہیں، مگر کیا کیا جائے کہ شاہ اسماعیل نے خفیہ سفر پنجاب کے بعد ہی رائے قائم کی تھی کہ انگریز رحمدل ہیں اور سکھ ظالم و جابر ہیں۔ مختصر یہ کہ جب بروایت ”سوانح احمدی“ عزیز حج کی تعداد رائے بریلی میں جو چار سو تھی اور سیرت ”سید احمد شہید“ الہ آباد میں سات سو ہو گئی، پھر مہر صاحب کی ”سید احمد شہید“ کے مطابق کلکتہ میں سات سو تریس تک پہنچ گئی تو اس قافلہ کے لئے دس گیارہ جہاز کا انتظام کیا گیا۔ مگر ان جہازوں میں غیر مسافر بھی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کلکتہ جو رشک ارم بن گیا تھا محض تریس کا اضافہ کر سکا، اسی سے کلکتہ میں باب ہدایت کے مفتوح ہونے کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ الوداعی جلوس کا نظارہ مسلم وغیر مسلم اپنی اپنی چھتوں سے دیکھ رہے تھے اور (خوش قسمتی سے) لاٹ صاحب (۲) نے بھی اپنی کوٹھی سے یہ تماشا دیکھا تھا (سیرت سید احمد شہید) مگر وہ نظارہ قابل دید تھا جب کہ لنگر اٹھتے وقت ایک انگریز نے وحشت میں رواں دواں آکر سید صاحب کی خدمت میں نذر عقیدت کے طور پر کھانا پیش کیا اور سید صاحب نے فخر و مسرت کے ساتھ قبول فرمایا۔ سید صاحب کے سامان پر جو جہاز پر لا دا گیا تھا ایک سو ستائیس کا نمبر لکھ دیا گیا تھا تا کہ امتیاز کیا جاسکے، از روئے ابجد سید صاحب کے نام کے اتنے ہی عدد ہوتے ہیں (۳)۔ سید صاحب کا جہاز سب سے آخر میں روانہ ہوا تھا۔ الوداعی ہدایتوں میں سید صاحب نے

۱۔ لیلیٰ راہ چشم مجنوں باید دید ۲۔ اس زمانہ میں لاٹ صاحب ہسٹنگو تھا۔

۳۔ یہ یا تو الہامی حکم تھا یا شاہ اسماعیل کی جدت تھی یا انگریزوں کی تقلید۔

خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی تھی کہ جو شخص کہے کہ سید احمد کی توجہ میں تاثیر ہے اسے مفتری سمجھنا۔ یہ بات محض منجانب اللہ ہے۔ اس کے بعد سیلون۔ الپی۔ کالیکٹ، لنکا دیپ، امینی، عقیدی، سقوطرہ، عدن، منجا، حدیدہ، جدہ اور حدیبیہ کی راہ سے ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء کو بتاریخ ۲۸ شعبان (۲۱ مئی) مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا، گویا یہ سفر ۱۰ ماہ میں طے کیا۔ اس بحری سفر کے عجائب و غرائب بے شمار ہیں۔ بوجہ جہازی بیماری مولانا عبدالحی سے مسئلہ دریافت کر کے جمع بین الصلا تین کا حکم دے دیا۔ کوئی پشت پر آتا تو سید صاحب سلام کرتے اور سلام میں کسی کو سبقت نہیں کرنے دیتے تھے۔ لنکا کے قریب شیاطین نے حملہ کیا مگر شکست دے دی (سوانح احمدی) کچھ حالات سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کو تحریر فرمائے تھے اور اس خط کو شاہ اسماعیل نے طبع کروا کر سب میں تقسیم کیا تھا۔ (سوانح احمدی) کے مکتوب نمبر اص: ۱۶۹ کا خلاصہ یہ ہے:-

آخری ماہ شعبان ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء ہم بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں حج، زیارت مدینہ کا عزم ہے۔۔۔ (مختلف مشغولیتوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے) رائے بریلی کے نئے مکان کی روحانیت نے مجسم ہو کر وقت و داع گریہ وزاری کی۔ میں نے بہ حکم خدا سے جنت میں ساتھ لے جانے کا وعدہ کر کے تسلی دی۔ ڈلمبو سے جب ہم کشتیوں میں سوار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ فلاں کشتی میں تم نہ بیٹھنا۔ اسے ہم غرق کر دیں گے، مگر میں اپنی خطا کو محسوس کر کے اسی میں سوار ہوا۔ غیب سے ارشاد ہوا کہ تیری وجہ سے ہم نے حکم واپس لے لیا، اور کشتی کو غرق نہیں کیا۔ جب ہم کلکتہ سے چل کر دریائے شور میں پہنچے تو سمندز کی روحانیت نے مجسم ہو کر مجھے ڈرانا چاہا، میں نے کہا میں اور تو دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ تو اللہ سے ڈر، میں تجھ سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ پھر وہ منفعل ہو کر قائل ہو گئی۔ جب جہاز قاب و قمری میں پہنچا جو بے حد خطرناک مقام ہے تو تجلی نمودار ہوئی اور فرمایا تجھے غرق کر دیا جائے گا۔ میں نے سر نیاز جھکا دیا۔ ارشاد ہوا: اب غرق نہیں کریں گے (۱)۔ عدن میں نماز جمعہ

۱۔ اس خوشی میں سید صاحب نے جہاز پر محفل میلاد منعقد کی تھی۔ (سوانح احمدی: ص ۸۱۰)

کی جامع مسجد میں پڑھنا چاہتا تھا مگر اہل قافلہ کی وجہ سے متردد تھا کہ ان کو ساتھ لے جانا مشکل ہے۔ بشارت ہوئی کہ تم نماز پڑھنے جاؤ، جہاز پر قافلہ کی نگرانی ہمارے ذمہ ہے۔۔۔ میری دعا کی اجابت کی بشارت ہوئی کہ تیرے ہاتھ سے نشر و اشاعت ملک عرب میں ہوگی اور اس کے آثارِ قالمیم روم تک پہنچیں گے۔۔۔ مخا میں اسی طرح ایک ماہ کے قیام میں ہزاروں نے بیعت کی۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اس سال جتنے حج کریں گے تیری وجہ سے سب کو بخش دوں گا۔ محاذِ یلملم پر احرام کے لئے میں نے غسل کیا، جن لوگوں نے مجھے غسل کروایا ان سب کی بخشش کی اطلاع دی گئی۔ پھر خبر دی گئی کہ جو تلبیہ میں تجھ سے سبقت کرے گا اس کا تلبیہ میں نہیں سنوں گا، برذی طویٰ سے گزر کر عجیب حالت طاری ہوئی اور حاضرین نے دیکھا کہ میری لبیک کو شرفِ اجابت بخشا گیا اور ارشاد ہوا کہ جتنے گنہگار و شرمندہ دور سے ہمارے حرم میں آئے ہیں ان کو میں لایا ہوں اور مدعا ایسا ایسا ہے تو وہ خود مستحقِ رحمت و عنایت ہیں اور کچھ ایسا محسوس وا کہ ہند سے اقصائے بخارا تک سب کو بخش دیا۔ مجھے خطرہ و خیال ہوا کہ یہ عنایات محض احیاء کے لئے ہیں یا اموات بھی اس میں داخل ہیں۔ جواب ملا کہ سب کے لئے ہیں۔ چنانچہ سب کو رنج و تکلیف سے نجات مل گئی اور وہ سب خوش ہو گئے۔۔۔

(آخر میں تحریر ہے کہ)۔۔۔ دریں سفر سعادت اثر بسیار بشارات و عنایات رفیعہ از درگاہ رحمان جل شانہ، اس فقیر یافتہ است۔ اور یہ سب آپ کی توجہ کا صدقہ ہے۔ آئندہ بھی دعا فرمائیں۔ (اور اس خط کو اس جملہ پر ختم کیا ہے کہ) زیادہ بجز آداب چہ عرض نماید۔ والسلام والا کرام۔“

اس خط کو سن کر شاہ صاحب کے دوست مولوی محمد نعیم صاحب نے اعتراض کیا تھا، چنانچہ شاہ صاحب نے بذریعہ خط اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ضمیر سوانح احمدی خط نمبر ۲)۔

”از جانب خدا برائے تربیت طفلان طریقت کہ تابع شخصے شوند۔ آنہارا بسوی فطرت رضا کنند، اتفاق شود مانند آن کہ طفلے در مکتب می برند و استاد





ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد نے لطافت کے ساتھ ان کی کرامات کا ذکر کیا ہے، یعنی جب کوئی سید صاحب کی زیارت کے لئے آتا تو دروازہ پر شاہ اسماعیل سمجھا دیا کرتے تھے کہ سید صاحب پہلی نظر میں اللہ کے جلوؤں سے مشرف کر دیا کرتے ہیں، لیکن آنے والا اگر ولد الزنا ہو تو اس کو یہ سعادت نہیں ملتی، لہذا اولد الزنا ہونے سے بچنے کے لئے ہر شخص یہی کہہ دیتا کہ سید صاحب نے واصل بحق کر دیا، پھر وہ ہزاروں کرامتوں کا بھی اقرار کیا کرتا تھا، حالانکہ اسے نظر کچھ بھی نہ آتا تھا، بہر حال ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ کو حرم محترم میں داخلہ ہوا اور یکم ذیقعدہ ۱۲۳۹ھ کو حجاز سے واپس آئے۔ مکہ معظمہ میں ابتدائی قیام کی مدت چار ماہ ہے۔ اس عرصہ میں فتوحات، عنایات اور نشر و اشاعت کا ذکر آب و تاب سے لکھا گیا ہے۔ مدینہ منورہ میں پچیس دن یا ایک ماہ گزارا۔ پھر وہاں سے واپس آ کر مکہ مکرمہ دو یا ڈھائی ماہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ مگر اس قیام کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے، سفر حج کے جو حالات لکھے گئے ہیں ان کا مطالعہ و مقابلہ بصیرت افروز ہوگا، لہذا ملاحظہ ہو:-

سوانح احمدی۔ جہاز سے اتر کر جدہ میں پانچ روز قیام کیا، بعد نماز عشا اونٹوں پر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ میں یاروں کے ساتھ دعا میں مشغول رہے۔ داخل حرم ہونے پر مسجد کو دیکھ کر قافلے والوں پر اس قدر رقت و زاری طاری ہوئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں، یہاں تک کہ معلم و مطوف اور حاضرین سب کے سب رونے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنی ساری عمر میں ایسا بابرکت قافلہ کسی ملک سے آتا نہیں دیکھا۔

ملک عرب کے بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بلغار کے قافلہ کا ایک بہت بڑا عالم جو فارسی جانتا تھا، بیعت سے مشرف ہوا۔ اس کو ملک بلخاری کی ہدایت کے لئے خلیفہ مقرر کیا اور ایک نقل صراط مستقیم کی عنایت فرمائی۔ مکہ کے تین بزرگ صاحب کمال اولیاء میں سے تھے انہوں نے کشف ماطن سے معلوم کر کے

اطاعت و فرمانبرداری کی۔ یہ تینوں سید صاحب کے ساتھ طواف کیا کرتے تھے۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا تو جواب دیا کہ اس بزرگ کا ہر طواف مقبول بارگاہ ایزدی ہے، اور ان کے ساتھ طواف میں رہنے والوں کا بھی طواف مقبول ہے۔

جبل رحمت پر دعائمانگی کہ ہمارے قافلہ والوں میں سے کسی کو بھی ساتھ لقب ”حاجی“ کے لقب نہ کرنا۔ سب تذکرہ نویس متفق ہیں کہ بوجہ قبولیت دعا کے آج تک کوئی آدمی اس قافلہ کا حاجی کے لقب سے ملقب نہیں ہوا۔ اس واسطے قوی امید ہے کہ باقی دعائیں بھی قبول ہوئی ہوں گی۔۔۔ اب تیاری سفر مدینہ کی ہونے لگی، اثنائے راہ میں عرب کے لوٹیرے گھاٹ میں تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ ان کے سردار نے حاضر خدمت ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ آدھی رات کو وادی فاطمہ میں حضرت ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر واسطے زیارت کے تشریف لے گئے۔ صاحب ”مخزن احمدی“ کا کہنا ہے کہ خلاف فصل ہمیں وہاں تازہ انگور کے خوشے ملے۔ وادی صفریٰ میں شیخ عبدالرحیم اور حضرت ابو عبیدہ بن الحارث جو غزوہ بدر میں زخمی ہوئے تھے ان کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جب مدینہ تین کوس رہ گیا تو سید صاحب کو بخار آ گیا، یہاں بھی لوٹیرے حملہ کرنا چاہتے تھے مگر بخیر گزشت۔ حضرت خاتون جنت اور حسین رضوان اللہ عنہم اجمعین نے خواب میں بشارتیں دیں۔ باوجود بیماری کے تبرک مکانات کی زیارتیں کیں۔ اہل مدینہ نے بیعت کی، دودو گھڑی تک سید صاحب مرقد مبارک رسول اللہ ﷺ کے سامنے مراقب رہتے تھے۔

۲۶ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو خواب میں رسول کریم ﷺ نے اجازت دی کہ مکہ کو واپس جاؤ، کیونکہ شدت سرما سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ لہذا ۲۹ ربیع الاول کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ مکہ شریف آ کر ۱۵ شوال کو ساڑھے چھ ماہ بعد وطن مالوفہ کو مراجعت کا الہام ہوا۔ پھر بادل محزون یکم ذیقعدہ کو جانب وطن روانہ ہوئے۔۔۔۔۔ جدہ میں چھ روز قیام کیا۔ اس سفر میں شاہ جنات اور اس کی ذریات کو بھی بیعت کا شرف عطا

کیا۔ اور غائبانہ طور پر وہ حفاظت کے لئے ساتھ رہنے لگے۔ اس کی مفصل تفصیل وزیر الدولہ نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ محاذ میں پندرہ روز قیام رہا۔ پھر یہاں سے چودھویں روز بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں تھوڑا قیام کیا، یہاں سے ایک مہینہ کے بحری سفر کے بعد کلکتہ تشریف لائے اور دو ماہ سے زیادہ قیام رہا۔

حیات طیبہ: بمبئی سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جدہ پہنچتے پہنچتے دو تین جانیں تلف ہو گئیں۔ حاملہ عورتوں کے بچے پیدا ہوئے۔ ایک کا حمل گر بھی گیا تھا۔ جدہ والوں کو سید صاحب کے آنے کا علم نہ ہوا، اس لئے آرام کرنے کا موقع مل گیا، ورنہ وہ لوگ حاضر خدمت ہو کر بہت پریشان کرتے۔ مکہ شریف میں پہلے سے خبر ہو گئی تھی کہ وہاہیوں کا قافلہ آرہا ہے۔ وہاہیوں کی پابندی شرع کی وجہ سے مکہ و مدینہ والے خائف تھے۔ سید صاحب وغیرہ کو شریف مکہ نے طلب کیا، انہوں نے اپنے عقائد کے متعلق صفائی پیش کر دی، تو نجات مل گئی۔ پھر شریف مکہ نے اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اس کے بعد ہر بلا سے محفوظ ہو گئے۔ اور مادر وطن کو بخیریت واپس آئے۔ حج بیت اللہ کے وقت نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی، اسی وجہ سے ڈاکٹر ہیوجز نے لکھا ہے کہ:-

”سید صاحب نے نجدیوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان سے عقائد لئے تھے مگر یہ غلط ہے۔ ان کو تعلیم دینے کے لئے ان کے ہمراہ خود شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور دیگر علماء موجود تھے۔ سید صاحب کا اثر بمبئی میں اتنا نہیں تھا جتنا کلکتہ میں تھا۔ ہندوستان آ کر جہاد کی تحریک شروع کی۔ ۲۹ شعبان ۱۳۳۰ھ کو وطن میں داخل ہوئے۔“

سیرت سید احمد شہید

اس ارض مقدس میں آپ کا فیض بند نہیں ہوا۔ حجاز کے بعض نامور اہل علم و کمال و فضل و صلاح بیعت میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کے حکم سے مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے برابر وعظ فرمائے۔ یہاں تمام ممالک اسلامیہ کے وفود آتے ہیں۔ اس لئے باہر کے لوگوں کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ بلغار کے قافلہ نے

بیعت کی۔ مغربی قافلہ بھی بیعت سے مشرف ہوا۔ مولانا عبدالحی نے صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کر کے اس کی نقلیں تقسیم کیں، بخیر و خوبی مراسم حج ادا ہوئے۔ جبل رحمت پر دعا مانگی۔ کہ ہمارے قافلے کا کوئی آدمی بھی حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہو۔ جاوا کے تین آدمیوں نے بیعت کی، مکہ مکرمہ سے آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور کافی قیام کیا۔ ۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ آئے۔ اور وہاں رمضان و عید کے مہینے گزارے اور یکم ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ کو مکہ مکرمہ کو الوداع کہا۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ مہینے کے بعد وطن آگئے۔

### سید احمد شہید

ایک مہینہ قیام کر کے مخا سے چلے تو حدیدہ ٹھہرے۔ یلملم کے محاذ میں پورے قافلہ نے غسل کر کے عمرے کا احرام باندھا۔ صدائے لبیک سے پورا جہاز گونج اٹھا۔۔۔۔۔ جدہ میں اماحوا کے مزار کی زیارت کی۔ جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے تھے ان میں سے اکثر مکہ معظمہ جا چکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے انتظار میں ٹھہرے رہے۔۔۔۔۔ مولانا اسماعیل کو یہاں محاصل کے تصفیہ کے لئے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہو گئے۔۔۔۔۔ کلکتہ میں مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کے لئے دے دی گئی تھیں۔ جدہ میں ان رقموں کا حساب لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپیہ زائد خرچ ہوئے۔۔۔۔۔ سید صاحب نے یہ رقم ادا کر دی۔ جدہ کے بعد ایک مقام حدیدہ میں قیام کیا۔ پھر حدیبیہ ٹھہرے۔۔۔۔۔ تیسرے روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔۔۔۔۔ قافلہ کے لوگ خدا کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ مکہ معظمہ میں دیر تک حضرت خدیجہ کے مزار پر مصروف دعا رہے۔ عبید اللہ کی بیوی سے اپنی نوزائیدہ بچی کو دودھ پلویا، بعد کو سید صاحب کی عبادت میں پریشانی ہوئی تو اس سے معافی مانگی۔ شاہ اسماعیل کی والدہ ایسی بیمار ہوئیں کہ زندگی کی امید نہیں رہی۔ شاہ صاحب کی آرزو تھی کہ والدہ صاحبہ سید صاحب سے بیعت کر لیں، لیکن وہ فرماتیں کہ یہ تو خود ہمارے خاندان کے مرید ہیں۔ میں بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب ان کے

مرید ہونے کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا تو اس کے مطابق سید صاحب سے بیعت کر لی۔ اسی بیماری میں بعد بیعت دوسرے دن فوت ہو گئیں اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔۔۔ ادائیگی حج کے موقع پر جبل رحمت پر دعائیں کہ قافلے والے حاجی کے لقب سے ملقب نہ ہوں، اس لئے کہ حج اسلامی فرض ہے، اسے بجالانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے۔۔۔۔۔ سینکڑوں علماء و صلحاء و اشراف سے ملاقاتیں ہوئیں، ان میں سے ایک مغرب اقصیٰ کے تھے۔۔۔ جاویوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی مولانا عبدالحی نے حرم پاک میں مشکوٰۃ کا شاہ اسماعیل نے حجۃ البالغہ کا درس شروع کیا، مولانا عبدالحی نے اس اثناء میں صراط مستقیم کا ترجمہ عربی میں کیا جس کی نقلیں بعض اصحاب نے لیں (۱)۔ او آخر حرم میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ راستہ میں سید صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ بعض اوقات بیہوش ہو جاتے تھے، مگر مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے تندرست ہو گئے۔ آدھی رات کے وقت مدینہ منورہ پہنچے۔ منافہ میں اترنے۔ غسل کر کے لباس بدلا۔ صبح کو شہر کا دروازہ کھلا تو اندر داخلہ ہوا۔ حرم مدینہ کے تمام ترکی آثار کی زیارت کی۔ اس زمانہ میں نجدیوں سے ارباب حکومت بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ ختم ہوئے چند سال ہی گزرے تھے۔ اگر کوئی شخص موحدانہ عقیدے کی اشاعت میں سرگرم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے وہابی سمجھ کر مواخذہ کا تختہ مشق بنا لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیونوی بہت تیز مزاج تھے۔ ان کی شکایت ہوئی کہ وہابی ہیں، ان پر مقدمہ چلا تو مولانا عبدالحی نے ضمانت و وکالت کر کے نجات دلوائی۔ مدینہ منورہ میں سید عبد الرحمن نے دو پستول خریدے، مگر وہ چوری کے تھے، لہذا حاکم احمد شاہ کو واپس کر دیئے، حضرت ابو عبیدہ کے مزار کی زیارت کی۔ نواب وزیر الدولہ نے زیارت رسول ﷺ اور قرآن کی اجازت کا خواب لکھا ہے

۱- حیرت ہے کہ عربی میں لکھی ہوئی تقویۃ الایمان یعنی رد الاشراک تقسیم کیوں نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ تقویۃ الایمان مسترد و منسوخ ہو چکی تھی۔

(وصایا)۔۔۔ بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا مگر ہمراہیوں کے اضطراب کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اس لئے کہ سب کو لے جانا مشکل تھا اور پیچھے چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ مدینہ میں سردی تیز ہو گئی تو واپس آئے۔ دس گیارہ دن سفر میں لگے۔ ایک مہینہ مدینہ منورہ میں گزار کر ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو واپس ہوئے۔ وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ جس روز مدینہ منورہ پہنچے تھے اسی روز رات کو بخارا آ گیا تھا۔ اپنے قیام گاہ کی کھڑکی میں روضہ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عرض کیا کہ ”غلام علی الہ آبادی نے جو قرآن شریف یہاں کی تلاوت کے لئے بھیجا ہے، اگر حضور اجازت دیں تو الماس صاحب کو وہ نسخہ دے دوں، کیونکہ وہ باقاعدہ تلاوت کے عادی ہیں، ورنہ یہاں قرآن شریف رکھے ہوئے ہیں اور کوئی تلاوت نہیں کرتا۔۔۔ مکہ شرف اگر ہمراہیوں میں سے جن جن کے کئے جہاز میں جگہ نکلتی گئی انہیں ہندوستان بھیجتے گئے۔ خود پہلے کی طرح مشغول عبادت رہے۔۔۔ فرماتے ہیں کہ خیال آیا ہندوستان دارالحرب ہے۔ بہتر ہے کہ حرم پاک میں بیٹھا رہوں (۱)، لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ اگر تم نہیں جاؤ گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لے لیں گے۔ اسی پر واپس کا ارادہ پختہ ہو گیا۔ ۱۵ شوال کو مکہ سے چلے۔ ذیقعدہ کے آغاز میں جدہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے کہ چار جہاز کرایہ پر لینے پڑے (گویا نصف سے زیادہ ساتھی روانہ کئے جا چکے تھے) منا میں ایک مہینہ گزارا پھر ذوالحجہ کو بمبئی پہنچ گئے، وہاں سے اپنی وغیرہ ہوتے ہوئے ۶ صفر ۱۲۳۹ھ کو کلکتہ آ گئے۔ کلکتہ میں خاصی دیر قیام رہا، پھر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے دو سال دس ماہ بعد ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ مطابق ۹ اپریل ۱۸۲۳ھ کو وطن آ گئے۔ کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپے موجود تھے۔

سفر حجاز کے حالات و واقعات مختلف راویوں اور سوانح نویسوں کے بیان

۱۔ مگر جہاد تو ان کی سرشت میں تھا، ہندوستان کو جب دارالحرب تسلیم کر لیا تو ایسا خیال کیوں آیا۔



کردہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ سخن سنج اس سے مضمون آرائیوں کا خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خواب یک خواب است، اما بعد تعبیر ہا۔ اور اس سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ہر شخص نے اپنے قیاس سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، اور حقیقت سے بے نیاز ہو کر ان سب کی چگونگی اور بوقلمونی بذات خود دلچسپی کے ساتھ وقت کاٹنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، مگر ان سب کے اختلافات نشاندہی کر دیتے ہیں کہ اصلیت و واقفیت کچھ اور ہے۔ لب و لباب ان بیانات اور خوش خیالیوں کا یہ ہے کہ خلاف قیاس و امید حد سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرامتیں حسب معمول تماشے دکھا کر جادو کا کام کرتی رہیں اور ان کرامتوں کی تشریح شاہ عبدالعزیز والے خط میں موجود ہے جو انہوں نے مولوی محمد نعیم کو لکھا تھا یعنی اس طرح طفلان طریقت کو ایسے عجائبات کے ذریعے ترغیب دی جاتی ہے، تا کہ ہمت افزائی ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی حیثیت طفل طریقت سے زیادہ نہیں تھی۔ اس خط میں یہ بھی امید ظاہر کی گئی ہے کہ شاید آگے چل کر سید صاحب ابدال بنا دیئے جائیں مگر عام طور پر ابدال مجذوب و مستتر ہوا کرتے ہیں۔ کشف و کرامات کے متعلق خود ”صراط مستقیم“ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

”ان طلسماتی نظاروں سے مومن کا ایمان عزم و اتباع سنت بڑھتا ہے لیکن وہ کمال جو انسان سے مطلوب ہے ان کشف و کشف سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔“

اس حقیقت کے کھل جانے پر ان کے معتقدین سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کرامتوں کا جو ڈھونگ رچایا ہے وہ کمال کی علامت کیسے بن گیا۔ یہ ان صاحبان کی عجائب پرستی اور بدعت دوستی کی دلیل ہے۔ انہوں نے ان کرامتوں کے اظہار سے سید صاحب کو جھنجھنا بنایا ہے اور سیدھے سادے مسلمانوں کو فریب میں ڈالا ہے۔ اہل فہم اس حرکت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے کے لئے مجبور ہیں۔ الفاظ کو چمکا کر انہوں نے معنوں کو خبط کر دیا ہے۔ اس لئے ان کے عقائد بھی مجھوب ہو کر رہ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قافلہ مبشرہ کے پہنچنے سے پہلے یہ خبر مکہ معظمہ میں پہنچ چکی تھی کہ ان صاحبان کے عقائد نجدیوں اور وہابیوں جیسے ہیں۔ ایسی افواہوں سے بدگمانی کا پیدا ہو جانا فطرتی و لازمی تھا۔ قدم اول پر شریف مکہ نے ان سے استفسار کیا تو انہوں نے صفائی پیش کر کے یقین دلا دیا کہ ہم نہ وہابی ہیں اور نہ نجدیوں کے اعتقادات رکھتے ہیں، ہر چند انہوں نے منطقی مغالطوں سے کام لیا ہو مگر اسی کو تقیہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال شریف مکہ کو مطمئن کر دیا گیا مگر یہ درون خانہ کی صفائی افواہ کی عام شہرت کو نہیں مٹا سکتی تھی اور اسی کو کہتے ہیں ”بداچھا بد نام برا“ اس شک و شبہ کی حالت میں لوگ ان سے دور رہے اور درمیان میں ایک خلیج واقع ہو گئی۔ لہذا پر جوش استقبال کا دعویٰ اور ادعائے مقبولیت معلوم۔ مرزا حیرت کہتا ہے کہ حج میں نجدیوں سے ملاقات ہوئی تھی جس کی بناء پر ڈاکٹر ہیو جرنے یہ رائے قائم کی۔ انہوں نے نجدیوں سے عقائد مستعار لئے مگر میرزا صاحب کو اس سے قطعی انکار ہے اور علانیہ کہتے ہیں کہ نجدیوں کی ملاقات سے پہلے ہی سے ان کے عقائد ذاتی طور پر ایسے ہی تھے، اور اگر ان کے عقائد میں کوئی سقم ہوتا تو اس کو دور کرنے کے لئے مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل اور دیگر علما خود ان کے پاس موجود تھے۔ لہذا نجدیوں سے انہوں نے سبق نہیں پڑھا، اس کے مقابل میں مولانا مہر صاحب کا اعلان ہے کہ ترکوں اور مصریوں نے نجدیوں کو اس درجہ کچل دیا تھا کہ حجاز میں آنے کی نجدیوں کو ہمت ہی نہیں تھی۔ لہذا ایسی صورت میں نجدیوں کے حجاز آنے اور ان سے سبق لینے کی افواہ غلط ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا تھانوی کے ملفوظات ”حسن العزیز“ (۱) کی جلد اول میں لکھا ہے کہ:-

ترکوں کے تسلط کے بعد بھی حجاز میں نجدیوں کے خفیہ اڈے موجود تھے۔ چنانچہ ایک نجدی سے حاجی امداد اللہ کے مناظرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اس بیان سے مرزا حیرت کے بیان کی تائید اور جناب مہر کے ارشاد کی تردید ہو جاتی ہے۔ ”موج

۱۔ مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔

کوثر“ میں شیخ محمد اکرام صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ: ”سید صاحب کو حجاز میں وہابیوں کے عقائد سے باخبر ہونے کا موقع ملا تھا۔ سید صاحب کے اور وہابیوں کے عقائد میں بہت اشتراک ہے، اس لئے ان کے بہت سے ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہوئے تھے۔۔۔ چنانچہ شاہ اسماعیل نے سفر حج سے واپس آ کر اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ البتہ مولانا عبدالحی ان سے متفق نہیں تھے اور سید صاحب کے متعلق اختلاف رائے ہے۔“

جناب اکرام کی تحقیق مستشرقین جیسی ہے جو محض قیاس سے گول مول نتیجہ نکال لیا کرتے ہیں اور کلیہ بنا لیتے ہیں۔ اکرام صاحب نے تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کا خود مطالعہ فرمایا ہے اور اس پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ انہوں نے نجدیوں کے اثرات کا حجاز میں قبول کرنا لکھا۔ میرزا حیرت اور جناب مہر کا خیال یقیناً صحیح ہے کہ اس موقع پر نجدیوں سے ان لوگوں نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ مہر صاحب نے تو صاف کہا ہے کہ:

مدینہ طیبہ میں موحدانہ عقائد رکھنے کی وجہ سے مولوی عبدالحق نیوتوی پر مقدمہ چلا تھا۔ تاریخ سے اگر شواہد طلب کئے جائیں تو واضح ہوگا کہ ترکوں کے تسلط کے بعد نجدیوں کا اثر مخا اور حدیدہ میں باقی و جاری تھا۔ وہیں سے یہ لوگ خفیہ طور پر حجاز کے اوپر اثر ڈالتے تھے اور سید صاحب کے حالات سے ظاہر ہے کہ آتے جاتے مخا میں طویل قیام کیا اور حدیدہ میں ہندوستانی دوست نے دعوت کی تھی۔ قافلہ کے نجدی الخیال ہونے کی خبر حجاز میں یقیناً ان ہی مقامات سے پہنچی تھی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات و عقائد اس قافلہ کے سفر حجاز سے پیشتر کے تھے۔ اور تاریخی حقائق مظہر ہیں کہ اس قسم کے موحدانہ عقائد ہندوستان میں محمد تعلق کے عہد میں موجود تھے۔ اسی زمانہ میں ابن تیمیہ کی تعلیم ہندوستان میں رائج ہوئی تھی۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امام ربانی حضرت مجدد سرہندی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک نے ابن تیمیہ اور ابن عبد الوہاب نجدی کی تجدید کو مخلوط کر کے موحدانہ

عقائد کو فروغ دیا تھا۔ شاہ فخر، شاہ ولی اللہ کے ہم عصر ہیں، ان کے ملفوظات سے منقول ہے کہ محمد فخر نامی ایک عرب نے دہلی آ کر اس قسم کی تبلیغ کی تھی اور نجدیوں کے اصول کے مطابق دہلی میں قبروں اور قبوں کو ڈھانے کا آغاز کیا تھا۔ لوگ انہیں ”لبابی“ کہا کرتے تھے۔ شاہ عبد العزیز کے زمانہ میں بھی نجدی تعلیم کی تبلیغ نہ جانی تھی۔ کتاب التوحید کا نسخہ سب سے پہلے ایک مراد آبادی صاحب حجاز سے یہاں لائے تھے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے جملہ سامان دہلی میں سید صاحب کی بیعت اور تبلیغی دوروں سے پہلے ہی سے موجود تھے، اور اسی پر اپنی تجدید کی بنیاد رکھ کر شاہ اسماعیل نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ فرمانا شروع کئے تھے۔ اور ان ہی ”موحدانہ“ عقائد پر علامہ فضل حق خیر آبادی سے مباحثہ ہوا کرتے تھے۔ انہیں مباحثوں کی وجہ سے شاہ اسماعیل میں افراط و غلو کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے علی الرغم شرک کے دائرہ کو از حد وسیع کر دیا تھا۔ چنانچہ تقویۃ الایمان کا مسودہ اپنے احباب کو دکھاتے وقت اس امر کا انہوں نے خود اقرار کیا تھا۔ ”تحفہ محمدیہ“ میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت شاہ اسماعیل تقویۃ الایمان لکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کا ایک شاگرد مسکی امام بخش اس کا مسودہ ہر روز رات کو مولانا مملوک علی کو لے جا کر دکھا دیا کرتا تھا۔ اور وہ روزانہ اس حصہ کا رد لکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب تقویۃ الایمان مکمل ہوئی تو مولانا مملوک علی کا رد بھی تکمیل کو پہنچا۔ اس رد کو مولانا مملوک علی نے ۱۸۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ مولانا مملوک علی تقویۃ الایمان کا تلفظ قاف کو ف سے بدل کر لیا کرتے تھے۔ یعنی ”ایمان کو فوت کرنے والی کتاب“ کہتے تھے۔ اس واقعہ سے تقویۃ الایمان کی تصنیف کا تعین ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۷ء سے پہلے کیا جاسکتا ہے۔ تقویۃ الایمان (۱) میں وہی مسائل ہیں جن پر بحث ہوئی تھی۔ جہاد کے متعلق ایک حرف بھی اس میں موجود نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ پنجاب کے خفیہ دورہ سے پہلے شاہ اسماعیل تقویۃ الایمان لکھ چکے تھے اور تقویۃ الایمان سید

۱۔ موجودہ تقویۃ الایمان کا دوسرا حصہ شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد محمد سلطان خان صاحب نے لکھا ہے مگر مطالب شاہ اسماعیل کے ہی ہیں۔ (حیات طیبہ) لیکن وہ کامیابی کے ساتھ نہ لکھ سکے۔ (سوانح احمدی)

صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے یقیناً بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ صراط مستقیم دراصل تقویۃ الایمان کی نقل رپٹ ہے، اس میں کچھ ترمیم و تفسیح بھی کی گئی ہے اور اس میں مسئلہ جہاد کا بھی ذکر ہے۔ ان جملہ واقعات سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ سفر حج سے بہت پہلے ہی قافلے والوں کے موحدانہ عقائد تھے۔ صراط مستقیم کا عربی میں ترجمہ کر کے حجاز میں نقلیں تقسیم کی گئی تھیں۔ اس میں بھی موحدانہ عقائد بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اب وہ کون سی عقل ہے جو اس بات کو تسلیم کر لے کہ صراط مستقیم کے مضامین کو اہل حجاز نے اچھی نظروں سے دیکھا، اور اس کی وجہ سے اس قافلہ کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں، ان حضرات کے بیانات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ وہاں بیعت کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے، بلغار کا ایک عالم مرید ہوا تھا۔ نہ بلغار کا کل قافلہ۔ جادیوں میں محض تین شخصوں کی بیعت کا اعلان ہے۔ یعنی اقبال ہے کہ کل قافلہ نے بیعت نہیں کی۔ اس طرح پیشین گوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی، کہ اقلیم روم اور اقصائے بخارا تک ان کی تعلیم کی رسائی ہوئی۔ لہذا یہ داستان محض زیب داستان ہے اور صفحہ قرطاس کی رونق ہے۔

مدینہ منورہ کی واپسی کا سبب بھی ایک چستان ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ سرد موسم کی وجہ سے قافلہ کو تکلیف ہو رہی تھی، اس لئے ازراہ رحم رسول کریم ﷺ نے اجازت رخصت دے دی، پھر یہ بھی خیال ہے کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے موحدانہ خیالات پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا وہ بھی واپسی کا سبب ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ مدینہ منورہ پہنچ کر شاہ اسماعیل نے گل افشانی کی تھی کہ شدہ رحال کی حدیث کے مطابق مسجد نبوی کے لئے سفر جائز ہے۔ اس لئے میں صرف مسجد نبوی میں نماز پڑھنے آیا ہوں۔ رسول پاک کے مزار اطہر کی زیارت ضمناً حاصل ہو گئی۔ ان امور کی وجہ سے مدینہ والے ان صاحبان سے الفت نہیں جتا سکتے تھے۔ وہ ان کے درپے آزار ہو گئے، اور خیریت اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو آئیں۔ (تحفہ محمدیہ: ۱۲۶)

اگر رسول مقبول ﷺ کی بشارت صحیح ہے تو انہیں عقائد کی وجہ سے انہیں خارج البلد کرنے

کا مفہوم ترشح ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مولوی عبدالحق نیوتنوی کے مقدمہ اور شاہ اسماعیل کے شد رحال والے اعلام نے مکہ معظمہ والوں کے کان نہ کھولے ہوں۔ اور ابتدائی افواہوں کی وجہ سے جو انہوں نے غلط تاویل کر کے مطمئن کیا تھا، ان کی فریب دہی کو نہ سمجھ لیا ہو۔ مکہ معظمہ کے اسی آخری قیام میں یہ لوگ کچھ خاموش نظر آتے ہیں۔ پہلے کا سا جوش اور کرامتوں کا مینہ برستا نہیں معلوم ہوتا۔ نشر و اشاعت کرامات اور سلسلہ بیعت کے بجائے ان پر جمود اور سراسیمگی کا غلبہ ہے۔ یہی خلوت گزینی اور اچانک واپسی ظاہر کرتی ہے کہ تیار حج کو چھوڑ دینا معنی وارد کہ درگفتن نمی آید۔ اگر واپسی کے لئے فرمان الہی ہوا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ انہیں دوسرے حج سے محروم کرنا تھا، اسی وجہ سے وہ حاجی کے لقب سے ملقب بھی نہیں ہوئے اور یہ اللہ کا کرم خاص ہے کہ مکہ والوں کے غصہ و عتاب سے انہیں بچ جانے کا موقع دیا۔ حکم الہی ۱۵ شوال کو ہوا تھا اور انہوں نے یکم ذیقعدہ کو حج سے ایک ماہ پیشتر حجاز کو بادل محزون الوداع کہا۔ پندرہ دن کے اندر اتنے بڑے قافلہ کو جہازوں کا مہیا ہو جانا بھی ایک کرامت ہے، مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ کی واپسی کے بعد قافلے والوں کو جہازوں کی گنجائش کے مطابق بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس صورت میں حکم الہی کا تعین ۱۵ شوال نلط ٹھہرتا ہے۔ آخر یہ راز کیا ہے کہ بات بنائے نہیں بنتی۔ شاہ اسماعیل کی والدہ صاحبہ کی نیت کے خلاف مرض موت میں مرید کہنا بھی ایک معرہ ہے۔ مولوی معین الدین صاحب پھلتی بیمار ہونے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے دن سید صاحب نے مدینہ منورہ میں بتایا کہ آج سید معین الدین کا انتقال ہو گیا اور ان کا ذکر ملاء اعلیٰ میں ہو رہا ہے۔ (سوانح احمدی) اب عجوبہ ترین حقیقت ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا جب وصال ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں ہوا تو سید صاحب کو مطلق خبر نہیں ہوئی، اور ملاء اعلیٰ میں ان کا ذکر انہوں نے نہیں سنا، اور نہ ان کے وصال کے بعد سید صاحب نے اپنے پیر و مرشد کا کبھی ذکر کیا۔ البتہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحق



بڑی تاخیر کے بعد ۱۲۴۰ء میں دہلی پہنچے تھے۔ رسم تعزیت ادا کرنے کے ساتھ عقائد کے متعلق مسجد جامع میں مباحثہ بھی کیا۔ ان واقعات کو سن کر اور حالات معلوم کر کے کہنا پڑتا ہے کہ شے لطیف کی کمی یا ادھر ہے یا ادھر ہے، اور بات طے نہیں ہوتی۔ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ کیوں۔ اس سفر حجاز کا مبشرات سے سلسلہ ملانا ہر عامی کا کام نہیں۔ بادی النظر میں حال قال سے جدا معلوم ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۷ کا مفہوم یہ ہے کہ حج میں رفٹ، فسوق اور جدال نہیں ہونا چاہیے، مگر یہاں یہ سب کچھ ہوا۔ ایسی حالت میں اس سفر حجاز کو وسیلہ ظفر کوئی کیسے مان سکتا ہے:

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے  
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

☆☆☆☆☆☆☆☆

## سیاسی ماحول

بہ ہر لحظہ بہر ساعت بہ ہر دم  
دگرگوں مے شود احوال عالم

دنیا جانتی ہے کہ سلطنت مغلیہ انگلشیہ کس طرح بن گئی۔ آخری تاجدار ان مغلیہ کی غفلت و عیش پسندی کا مرثیہ اور انگریز سوداگروں کی فتح مندی کا قصیدہ سنتے سنتے کان تھگ گئے ہیں، مگر کچھ ایسی ہوا بندھ گئی کہ کسی نے حقیقت واقعی کی طرف توجہ نہیں کی۔ انگریز سوداگروں کے عروج کی داستانوں میں خود ایسا سوز موجود ہے کہ سینہ کو بی کو جی چاہتا ہے اور خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صوبیداروں نے خود مختاری اختیار کر لی تھی، مگر یہ خود مختاری راس نہیں آئی، جنوبی وسطی و شمالی صوبیداروں کی زندگی بجلیوں کے سایہ میں گزری۔ شمالی حسلوں اور جنوب میں جاٹوں اور مرہٹوں نے قیامت برپا کر دی، مگر مشرق میں بنگال چین سے بیٹھا ہوا دولت کے انبار لگا رہا تھا۔ دیوان بنگال مرشد قلی خان کے سامنے انگریز سوداگر سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس نے ۱۷۵۷ء کے معاہدہ کے ذریعہ انہیں جکڑ بند کر رکھا تھا۔ وہ قلعہ کلکتہ یعنی فورٹ ولیم سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد علی بردی خان کی نوابی کے حضور میں بھی وہ دم نہیں مار سکتے تھے۔ مگر ۱۷۵۶ء میں جب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انہوں نے پرزے نکالنا شروع کر دیئے۔ یہ جرأت یوں ہوئی کہ پرتگال اور فرانس والوں کی طرح وہ بھی ملکی سیاست میں حصہ لے کر دولت کمانا چاہتے تھے۔ یہ افواہ کہ سراج الدولہ

نا تجربہ کار، نا اہل، رنگیلا اور نا عاقبت اندیش تھا۔ کوئی معنی نہیں رکھتی، اب تک فرانسیسی اور ڈچ فوجیں اکٹھی کرتے تھے۔ ریاستوں کی فوجوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، اور حکومتوں کی خانہ جنگیوں میں کسی نہ کسی فریق کے مدد و معاون بن کر معاوضہ و منافع حاصل کیا کرتے تھے۔ اب انگریز سوداگروں کو بھی طمع اور ہوس پیدا ہوئی، اور یہی اصول اختیار کیا۔

ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کا بانی کلائیو کو مانا جاتا ہے، وہ انگلستان کے آوارہ گرد نوجوانوں میں سے تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلہ میں اس کا ہندوستان میں آنا ۱۷۳۳ء میں ہوا۔ کئی برس کے بعد نظام اور نواب ارکاٹ کی جنگ ہوئی تو فرانسیسی سردار ڈوپلے نے ناصر جنگ کی حمایت کی اور ادھر انگریزوں کا کلائیو نواب ارکاٹ محمد علی کی طرف سے نمودار ہوا۔ ۱۷۵۱ء کی اس جنگ میں ڈوپلے نے کلائیو سے منہ کی کھائی اور کلائیو کی بہادری سے محمد علی کی ریاست ارکاٹ ہر خطرہ سے محفوظ ہو گئی۔ اس کے بعد کلائیو کی قسمت میں بنگال کی فتح لکھی ہوئی تھی، سوائے سیم وزر کی طمع کے اس کا کوئی اور تصور و مقصد نہیں تھا۔ اپنی ان فتوحات کے بعد وہ اپنے وطن چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے کارناموں کے نتائج کی وجہ سے ایسا فتنہ اٹھا کہ انگریزی سوداگروں کو جان بچانا مشکل ہو گئی لہذا اس فتنہ و فساد کے فرو کرنے کے لئے ۱۷۶۵ء میں وہ پھر بھیجا گیا لیکن بیمار ہو جانے کی وجہ سے ۱۷۶۷ء میں انگلستان جانے کے لئے مجبور ہو گیا، پہلی مرتبہ جب وہ وطن گیا ہے تو اس آوارہ گرد نوجوان کی آمدنی مستقل طور پر چالیس ہزار پونڈ سالانہ کی ہو گئی تھی، اور وہ اپنے ساتھ اعضاء و اقربا کے لئے پچاس ہزار پونڈ کی رقم لے کر گیا تھا (۱)، اس کا استقبال بڑی عزت و احترام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی دولت کی فراوانی کا علم عوام کو ہی نہیں بلکہ ڈائریکٹروں کو بھی تھا (۲)۔ اسی لحاظ سے کمپنی کے دوسروں افسروں کی دولت مند کی کا بھی

1. HISTORY OF ENGLAND IN THE 18th CENTURY, VOL PAGE 263.

2. MILL & NELSON, HISTORY OF INDIA 5th EDITION, PAGE 279.

اندازہ لگالیا گیا اور اس نتیجہ پر پہنچ کر کہ ہندوستان میں دولت آسانی سے مل جاتی ہے، انگلستان والوں نے اپنے بیکار و مجہول لڑکوں کو بھی کمپنی کا ملازم کروا دیا (۱)۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلائیو کا علییل ہو کر انگلستان جانا ہوا تو کمپنی کے ملازمین نے اس کی بے ایمانیوں اور رشوت ستانیوں کی شکایت کی۔ تحقیق کے لئے کمیٹی بنھائی گئی، جس نے عرصہ دراز کے بعد فیصلہ دیا کہ شکایت صحیح نہیں ہے، مگر کلائیو کے دل کے چور نے بیماری و پریشانی میں اس درجہ اضافہ کیا کہ بیزار ہو کر بانی سلطنت انگلشیہ بند نے ۱۷۷۳ء میں خودکشی کر کے تمام بلاؤں سے نجات پالی۔ کیتھ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ:

”کلائیو نے کمپنی کو بدنام و ذلیل کر دیا۔“

انگریز سوداگروں کی داستان کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ بنگال میں انگریز سوداگروں کے سر میں روپیہ کمانے کا سودا سوار ہوا تو سب سے پہلی حرکت یہ کی کہ نذرانہ اور دام لے کر کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سراج الدولہ کے مجرموں کو پناہ دینے لگے۔ سراج الدولہ نے جواب طلب کیا تو ان بہادروں کو بجز معافی مانگنے کے کوئی چارہ نہ تھا مگر معافی حاصل کرنے کے بعد ان خطا کاروں نے ۱۷۷۳ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے مرمت کے بہانے فورٹ ولیم کو وسیع کرنا شروع کر دیا تا کہ اپنے آپ کو اور زیادہ محفوظ کریں اور مجرموں کو چھپانے میں آسانی ہو۔ سراج الدولہ نے پھر جواب طلب کیا اور صاحب بہادروں نے ندامت کا اظہار کر کے اقرار کیا کہ اب ایسی خطا قبلہ حاجات نہ ہوگی۔ سراج الدولہ کچھ سی مگر مروت کا آدمی تھا، اس نے اعتبار کر لیا اور اوردرگزر کی۔ مگر یہ باز آنے والے نہ تھے۔ اس مرتبہ اپنی کیاوی سے ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے اپنی فوج میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اب نواب نے ایک نہ سنی اور فوج کشی کر کے نہ صرف قاسم بازار کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا، بلکہ فورٹ ولیم کو فتح کر کے ان

1 A.B. KIETH.A., CONSTITUTIONAL HISTORY OF INDIA 2nd EDITION 1937. PAGE 57

مکاروں کو بھگا دیا۔ اس معرکہ میں چند انگریز گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں مفتوحہ فورٹ ولیم کی ایک کوٹھڑی میں مقید کر دیا گیا تھا۔ ہونے والی بات کہ کافی ہوا کا گزرنہ ہونے کی وجہ سے کچھ قیدی دم توڑ گئے۔ انگریز مورخین نے بلیک ہول کی اصطلاح ایجاد کر کے عجیب روح فرسا داستان گڑھی اور نواب کو مطعون کر کے ساری دنیا کے دماغ سے یہ خیال محو کر دیا کہ ان قیدیوں کو محبوس کرنے کے بجائے قتل کرنے کا بھی سراج الدولہ پورا حق حاصل تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد فورٹ ولیم کو واپس لینے کے لئے مدراس سے کمک آئی۔ بحری فوج کا امیر مسٹروائسن تھا، اور بری فوج کی قیادت کلایو کے سپرد تھی، کلایو کے قدم پہلی مرتبہ بنگال میں اسی وقت آئے تھے۔ بحری حملہ کی مدافعت سراج الدولہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا انگریزی افواج نے کلکتہ کو تسخیر کر کے ۲ جنوری کو ۱۷۵۷ء کو ہنگلی بھی فتح کر لیا، صلح ہو جانے پر نواب کو فورٹ ولیم اور ہرجہ دینا پڑا۔ اس کے بعد کامیابی پر نازاں ہو کر انگریزوں نے چند رنگر کارخ کیا۔ نواب نے فرانس والوں سے مدد لے کر مدافعت کی، مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور دوبارہ صلح ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ابدالی نے پنجاب پر تاخت کی تھی۔ کلایو کی آنکھوں میں سراج الدولہ خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اب کلایو کو نئی سوچھی۔ اتفاق سے ایک سکھ تاجر امی چند کلایو سے مشورہ کرنے کے لئے آیا کہ نواب سے اپنا قرضہ کس طرح وصول کروں۔ کلایو نے جواب دیا کہ میر جعفر کو میرا طرفدار بنا دو تو تمہارا قرضہ ادا کر دوں گا اور جعفر کو نواب کی گدی دلوا دوں گا، جب یہ تدبیر مکمل ہو گئی تو خوئے بدر ابہانہ بسیار۔ سراج الدولہ کو الٹی میٹم دیا کہ گزشتہ معاہدہ کی خلاف ورزی جو آپ سے سرزد ہو رہی ہے، وہ گوارہ نہیں کی جاسکتی۔ نواب ابھی جواب نہیں دے پایا تھا کہ پلاسی پہنچ کر کلایو نے حملہ کر دیا۔ میر جعفر نے سازش کے مطابق سکوت اختیار کیا اور سراج الدولہ کو گرفتار

کر کے کچھ عرصہ بعد شہید کر دیا گیا۔ پلاسی کی یہ جنگ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو ہوئی تھی۔ معاہدہ کے وقت امی چند نے قرضہ کی ادائیگی کی شرط لکھنے کے لئے اصرار کیا۔ کلا یو کے تکلف کو دیکھ کر اس نے دھمکی دی کہ سازش کا راز افشا کر کے پانسہ پلٹ دوں گا۔ لہذا کلا یو نے دو معاہدے لکھوائے۔ ایک میں قرضہ والی شرط مذکور تھی، اور دوسرے میں نہیں تھی، پہلی کاپی دکھا کر امی چند کو مطمئن کر دیا، مگر دوسری کاپی پر دستخط کرادائے جس میں قرضہ کا ذکر نہیں تھا۔ معاہدہ بغیر واٹسن کے دستخطوں کے مکمل نہیں ہو سکتا تھا، اور اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ پلاسی کے حملہ کو وہ غلط سمجھتا تھا، مگر کلا یو نے واٹسن کو اطلاع کئے بغیر اس کی لاعلمی میں خود اپنے ہاتھ سے اس کے دستخط بنا دیئے۔ کلا یو کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے سلطنت انگلشیہ کی بنیاد پڑی۔ میر جعفر نے نوابی کی خوشی میں ملازمین و ممبران کو نسل کو دس لاکھ کا انعام دیا۔ اور کمپنی کے نام چوبیس پرگنہ کا علاقہ لکھ دیا۔ یہ علاقہ کلا یو کی جاگیر کے نام سے مشہور ہوا۔

پلاسی کی فتح کے بعد انگریز سوداگر اپنے آپ کو حاکم سمجھنے لگے۔ ان کی نظر میں حکومت کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقہ سے روپیہ وصول کرنا تھا۔ چنانچہ خوب نذرانے لئے، ڈٹ کر جرمانے کئے، زبردستی لوٹ مار کی اور پھر ضرورت مند امراء کو حد سے زیادہ شرح سود پر قرضے دیئے، ان حرکات ناشائستہ کی وجہ سے لوگ تھرانے لگے۔ انگریز کی صورت دیکھ کر گاؤں والے اپنے اپنے گھروں سے بھاگ جاتے تھے۔ دکانیں بند ہو جاتی تھیں اور راغبگیر بدحواس ہو کر رہ جاتے تھے۔ (۱)

میر جعفر کے نواب ہو جانے کی خبر سن کر دہلی کا شہزادہ عالی گہر یعنی شاہ عالم نواب وزیر اودھ کی معیت میں حملہ آور ہوا، مگر کلا یو کا نام سنتے ہی نواب اودھ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور مجبوری میں شاہزادے نے اپنے آپ کو کلا یو کے حوالے کر دیا مگر کلا یو کی سمجھ بوجھ اور دور اندیشی قابل غور ہے۔ اس نے شہزادے کی تعظیم و تکریم دل کھول کر کی اور نذرانہ کے طور پر پانسوا شرفیاں پیش کیں۔ شاہزادہ ہنسی خوشی واپس چلا

1. LOEKY: A HISTORY OF ENGLAND IN THE 8th CENTURY VOL IV, PAGE 264.



گیا۔ اب میر جعفر کو وہم پیدا ہوا کہ اس کا کرم فرما اس کی دولت لوٹ کر اسے ذلیل و تباہ کر رہا ہے۔ لہذا نجات پانے کے لئے میر جعفر نے ڈچ سے سازش کی مگر اس مقابلہ میں بھی کلا یو کو فتح ہوئی اور اس نے پھر میر جعفر کو اپنی غلامی میں قبول کر کے بحال کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷۵۹ء کا ہے جس کے بعد ۱۷۶۰ء میں کلا یو انگلینڈ واپس گیا۔

فتح پلاسی کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اس کی مثال دنیائے تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اب تک متعدد ایشیائی فاتحین نے ہندوستان پر تسلط جمایا تھا مگر اس قسم کی تبدیلی کبھی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ان فاتحین کا طرز زندگی اور طرز حکومت مفتوحین سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ مسلمان فاتحین کا مذہب اور ان کی زبان عربی یا فارسی اگرچہ مفتوحین سے ملتی جلتی نہیں تھی۔ مگر اس سے اجنبیت و غیریت نہیں پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے یہاں کی اقتصادیات، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو نقصان نہیں پہنچایا۔ قسبات کی زندگی کو بحال رکھا۔ ان کے یہاں سیاسی معاملات فاتح کے قبضہ میں رہے۔ اور نظامی و مالی معاملات میں ہندوستانیوں کو شریک کیا، یہی نہیں بلکہ وہ ایسے گھل مل کر رہے کہ یہاں کے تمدن کو خود قبول کر لیا۔ بعض ہندو مصلح اگرچہ ذات پات کے خود مخالف تھے مگر مسلمانوں نے ان کے ذات پات اور رسم و رواج اپنے یہاں رائج کر لئے، اس کے برخلاف انگریزی راج میں ان کے اصول اس درجہ علیحدہ تھے کہ سوسائٹی میں یکسانیت نہیں رہی اور زندگی کے ہر معاملہ اور شعبہ میں غیریت پیدا ہو گئی۔ فاتح و مفتوح میں بعد ہونے کی وجہ سے جو اختلاف ہوا وہ برطرف ملازمین کی دولت اندوزی سے خود کمپنی کو بے حد نقصان ہوا، اور ان میں تفریق پیدا ہو گئی۔ ملازمین مالدار بن گئے اور کمپنی غربت و افلاس کی زد میں آ گئی۔ میر جعفر میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ بد نظمی کو دور کرنے کے لئے ہر مرتبہ روپیہ مہیا کر سکے۔ لہذا ابدامنی کا ملزم بنا کر اسے معزول کر دیا گیا اور اس کے داماد میر قاسم کے سپرد نوابی کی گئی۔ اس صلہ میں میر قاسم کو بہت بڑی رقم اور چند اضلاع نذر کرنا پڑے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ میر

قاسم میں اپنے خسر سے زیادہ شے لطیف تھی، اس نے مرشد آباد کے بجائے مونگیر کو اپنی راجدھانی بنایا اور کمپنی کے ناجائز طریقوں پر کڑی نظر رکھی جس کی وجہ سے کمپنی کے ملازمین اور نواب کے گماشتوں میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ مئی ۱۷۶۲ء میں اس نے گورنر اور کونسل سے شکایت کی کہ کمپنی کے ملازمین ریاست میں فساد کرتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں، گماشتوں کو زور و کوب کرتے ہیں، بازار سے چوتھائی قیمت پر اشیاء خریدتے ہیں۔ اور اپنا مال پانچ گنی قیمت پر فروخت کرتے ہیں (۱)۔ جب شنوائی نہیں ہوئی۔ تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ جہاں ملیں، انگریزوں کو قتل کر دو۔ اس کے بعد شاہ عالم (۱۸۰۶ء-۱۷۵۹ء) اور نواب اودھ سے میر قاسم نے سازش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۶۳ء میں اسے معزول کر کے میر جعفر کو سہ بارہ نوابی عطا کر دی۔ مگر میر قاسم اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر ۱۷۶۴ء میں انگریزوں کے مقابل آیا۔ اس جنگ بکسر کی کامیابی نے انگریز سوداگروں کو مستقل طور پر بنگال کا مالک و حاکم بنا دیا۔ بوجہ عداوت کلا یو کو ۱۷۶۷ء میں ہندوستان چھوڑنا پڑا اور اسی سال میر جعفر کا بھی انتقال ہو گیا۔۔۔ دوسری مرتبہ جب لارڈ کلا یو ہندوستان تشریف لائے تو حسب عادت اپنی حریف سے کام چلایا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد کمپنی کے ملازمین نے ڈائریکٹروں سے ان کی رشوت ستانی اور لغویات کی شکایت کی۔ لہذا صاحب بہادر بیمار ہو گئے اور یہاں سے چلے گئے۔ شاہ عالم سے ۱۷۶۵ء میں دیوانی حقوق حاصل کر لینے کے بعد سات برس تک خوب جبر و تشدد کیا اور دو عملی کی اصلاح کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ پھر آسمانی غضب یہ ٹوٹا کہ ۱۷۶۹ء میں زبردست قحط پڑا جس کی وجہ سے ایک تہائی آبادی جانبر نہ ہو سکی، اور ہزاروں بیگمہ زمین بنجر ہو کر رہ گئی۔ (۲) رابرٹ اور کیتھ نے اس قحط کے جانی نقصان کو بہت زیادہ لکھا ہے۔ اب کمپنی کی جان مصیبت میں تھی۔ نہ آمدنی ہوئی نہ مصارف پورے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۶۷ء میں شرکاء کمپنی کے منافع کی شرح جو

1. WOODRUF. PHILIP, THE MAN WHO RULE IN INDIA, THE FOUNDERS, PAGE 106

2. MILLS, HISTORY OF INDIA, VOL V PAGE 376.

چند فی صدی سے دس فی صدی تک تھی۔ وہ اب ۱۷۷۲ء میں ساڑھے بارہ فی صدی تک پہنچ گئی۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے کمپنی کو حکومت انگلستان سے دس لاکھ پونڈ قرض لینا پڑا۔ غرض انقلاب یوں آتے ہیں۔ اور قسمیں یوں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ بہر حال کلائیو کو بانی سلطنت انگلشیہ کا لقب ملنا تھا۔ وہ بغیر کسی حجت کے مل گیا۔

۱۷۷۲ء میں گورنر بنگال وارین ہیسٹنگز ہوا۔ اس نے اپنے ہندوستانی تجربہ اور ذاتی فراست سے کلائیو کی حکمت عملیوں کو شرمندہ کر دیا۔ اخلاق و قانون اس کی نظر میں بے معنی الفاظ تھے۔ نواب بنگال اور مغل بادشاہوں سے جو معاہدے تھے اس نے سوخت کر دیئے۔ ۱۷۷۲ء کا ریگولیشن ایکٹ جو خرابیوں کو دور کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ہیسٹنگز کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ دیسی عملہ کو اس نے برطرف کر دیا۔ روہیلوں کو تباہ کر کے روہیل کھنڈ نواب اودھ کے سپرد کر دیا۔ نواب سے روپیہ نہ ملنے پر جبر و تشدد کے ساتھ بیگمات اودھ سے روپیہ وصول کیا۔ مہاراجہ بنارس سے کئی مرتبہ روپیہ وصول کیا مگر وہ جب نہ دے سکا تو اسے معزول کر دیا۔ اپنے مظالم سے ہندوستانیوں کو تباہ و ذلیل کیا مگر یہ سب کچھ کمپنی کو مالدار بنانے کے لئے کیا۔ لہذا ۱۷۷۳ء میں وہ گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ زمینداری کا نیا بندوبست بنایا۔ مالکداری وصول کرنے کے لئے کلکٹر کا عہدہ ایجاد کیا۔ مگر بائیں ہمہ کاشتکاروں اور زمینداروں میں حد درجہ اختلاف بڑھ گیا اور اس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوا، بلکہ رشوت ستانی اور منافع کے لئے راستے کھل گئے۔ ۱۷۷۳ء سے ۱۷۹۳ء تک حکام نے تہائی اراضی کا مالک اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ بیوں کو بنا دیا، لگان و مالکداری ادا نہ ہونے پر جائدادیں نیلام ہوتی تھیں اور بنئے روپیہ دے کر خرید لیتے تھے۔ (۱) مثال کے طور پر اس طرح اس نے اپنے ملازم خاص کنٹو کو بہت بڑی جائداد حاصل کر لینے کا موقع دیا (۲)۔ ہندوستانیوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے صدر دیوانی اور صدر نظامت کے محکمے قائم کئے جن سے مقدمہ بازی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کی زیادتیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے

1. R.C. DUT PAGE 61.

2. COMMITTEE OF CIRCUITS MINUTES DATED SEP 15- 1775

کونسل کے ممبروں نے اعتراض کئے تو ۱۷۸۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا اور بعد کو انگلستان میں اسی وجہ سے مقدمات میں ماخوذ ہوا۔

لارڈ کارناروالس کا عہد (۱۷۹۳-۱۷۸۶ء) دانشمندی و بیوقوفی کا مجموعہ۔ اس کی قابلیت میں کچھ شک نہیں۔ وہ نہ صرف ہندوستانی رسم و رواج سے ناواقف تھا بلکہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتا تھا اور ان کا بہترین دشمن تھا۔ ان کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے انہیں نااہل، بے ایمان اور تنگ نظر سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ توہمات عجائبات اور خرافات کی پرستش کرتے تھے۔ سر جان شور نے لکھا ہے کہ:-

”وہ ہندوستانیوں کی عزت و ناموس کو فنا کرنا چاہتا تھا اور انہیں بیکار بنا کر اور شرفاء کو ذلیل کر کے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو عہدوں سے علیحدہ کر کے اپنے نالائق اور نکلے انگریزوں کو آسانیاں بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے استمراری بندوبست کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیلام کی کثرت کی وجہ سے ۱۸۱۳ء تک زمینداری بیوں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ کاشتکار اس قدر پریشان ہوئے کہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس کی قانونی اصلاحات سے طویل مقدمہ بازی کا آغاز ہوا۔ جرائم بڑھے، فساد پھیلا اور بد امنی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنی قوم کی برتری اور افضلیت کا قائل تھا۔ انگریزوں کو اس قدر فوقیت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کو میٹھا کہا کرتے تھے“ (۳)

کمپنی کے فوجی افسر آوارہ و بد معاش قسم کے تھے۔ ان کو دولت کمانے کے علاوہ اپنے فرائض کا مطلق خیال نہیں تھا۔ ڈیوک آف یارک کا خط بنام کارناروالس اور ٹامس و گراٹ کی کتاب ان حقائق سے بھری ہوئی ہیں۔ ڈیوک آف ولنگٹن کی کتاب

Making Narrative of Marguess of wellsh Govt. of India ریمزے میور کی کتاب

The English of tilitarian & India اور برک اسٹوکس کی کتاب of India Page-209

اور گلکلیک کے Memories میں کارناروالس نے جو اصلاحیں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہندوستانیوں کے خلاف جو قوانین بنائے وہی اس کی غیر مقبولیت کا باعث ہوئے۔ مگر

اس نے گورنمنٹ کو مضبوط بنانے کے لئے جو خاکہ بنایا اگرچہ اس کے عہد میں ناکام ہوا مگر آئندہ اسی پر عمل کر کے سرکار انگلشیہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے صرف دو اصول تھے۔ یعنی انگریزی حکومت کا استحکام اور ہندوستانیوں کی آزادی کو فنا کرنا تاکہ وہ بغاوت نہ کرنے پائیں۔ مگر اس کے استمراری بندوبست سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو دولت جمع کرنے کے بعد حکومت کے لئے مضر ہوا۔ فوجداری اور عدالت ہائے انصاف کی علیحدگی کی وجہ سے افسروں کے اختیارات کم ہو گئے اور گورنمنٹ کے وقار کو نقصان پہنچا۔

وارین ہیسٹنگز کے عہد سے لے کر ۱۷۹۳ء تک ہندوستانی اور انگریزوں میں روابط رہے اور قومی و ملکی امتیازات تفرقہ نہ پیدا کر سکے۔ انگریزوں نے ہندوستانی رسم و رواج سیکھے اور میل جول کو جائز رکھا۔ وارین ہیسٹنگز خود فارسی و بنگالی خوب جانتا تھا۔ سر ولیم جونز سنسکرت کا ماہر تھا۔ اور اس نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا۔ انگریز ہندوستانی رؤساء و شرفاء کی دعوتوں اور جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں ناچ رنگ کا شوق تھا۔ ہاتھی کی لڑائیوں کا تماشا دیکھتے تھے اور حقہ بھی پیتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین ناکتھا ہوتے تھے۔ اس لئے ہندوستانی عورتوں کو ملازم رکھ لیا کرتے تھے۔ اور چار روپیہ ماہوار پر ان کے یہاں رہتی تھیں۔ ہندوستانی شرفاء انگریزوں کی دعوتوں میں شرکت کرتے تھے۔ انگریزی کھانے کھاتے تھے اور شراب پیتے تھے۔ مسلمان سور کا گوشت بھی کھانے لگے تھے۔ اور اس کا نام انہوں نے ولایتی ہرن کا گوشت رکھا تھا۔ ہیسٹنگز کے ہم جلس اور خاص دوست بنی رام، اس کا بھائی بشمبر، پنڈت گنگا، گوبند سنگھ اور علی ابراہیم خان تھے۔ مگر کارناوالس کے زمانہ میں یہ سب باتیں متروک ہو گئیں۔ تفریق شروع ہو گئی۔ غیرت کے حجاب حائل ہو گئے اور ملنا جلنا ختم ہو گیا۔ (۱)

ویلیزلی (۱۷۹۸، ۱۸۰۵) دیسی ریاستوں کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ ڈاکٹر بیٹروں

کی ہدایات کی پرواہ نہ کر کے اس نے ریاستوں میں امدادی طریقہ جاری کیا کہ فرانسیسی وپرتگالی علیحدہ کر دیئے جائیں، اور ان کے بجائے انگریزی فوج اپنے خرچے پر رکھی جائے۔ ٹیپو نے انگریزی فوج اپنے یہاں رکھنے سے انکار کر دیا۔ تو اس کے خلاف ۱۷۹۹ء میں جنگ شروع کی۔ وزیر میر صادق کی سازش سے سلطان نیپوشہید ہوا۔ سب ریاستوں پر قابو پالینے کے بعد مرہٹے رہ گئے تھے۔ لہذا جنرل لیک نے شمالی ہند کی طرف کوچ کیا۔ کرنل ویلزلی (ڈیوک آف ولنگٹن) اور اسٹیوینسن دکن کی طرف روانہ ہوئے، جنہوں نے سندھیا اور بھونسلا کو شکست دی۔ جنرل لیک نے علی گڑھ کا قلعہ لیا۔ دہلی پر حملہ کیا اور آگرہ فتح کیا۔ شاہ دہلی کی پٹن مقرر کر دی گئی اور اس کی حکومت قلعہ کے اندر رہ گئی۔ ویلزلی سے ڈائریکٹر خوش نہ تھے۔ اس لئے ۱۸۰۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر انگلستان میں اس پر بڑی بوچھاڑ ہوئی۔ ناخوشی کی وجہ یہ تھی کہ برٹش حکومت کے استحکام کے ساتھ وہ عوام کو تعزیرات سے نکال کر خوش حال بنانا چاہتا تھا۔

لارڈ منٹو (۱۸۱۳-۱۸۰۷ء) کا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کر کے دوستی کی۔ اور کابل و ایران کو سفارت بھیجی کہ یورپ کی کسی حکومت کو اپنے ملک سے ادھر آنے کا راستہ نہ دیا جائے۔ ۱۸۱۳ء میں لارڈ موٹرا یعنی لارڈ ہیسنگو نے مغل بادشاہ اکبر ثانی (۱۸۳۷ء-۱۸۰۶ء) کو نذرانہ دینا بند کر دیا، اور اکبر ثانی سے اختیارات چھین لئے۔ اسی سال انگریزی تعلیم شروع ہوئی۔ مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تھے، مگر شاہ عبدالعزیز نے جب فتویٰ دے دیا تو استفادہ کرنے لگے۔

لارڈ ہیسنگو (۱۷۹۳-۱۷۹۳) کے آنے پر یہاں غدر مچا ہوا تھا اور ریاستوں میں جھگڑے ہو رہے تھے۔ اس نے ڈائریکٹروں کو لکھا کہ ویلزلی کے طرز عمل سے جو فتنہ اٹھا ہے اس کو رفع کرنے کے لئے مجھے اختیار دیا جائے۔ چنانچہ گورکھوں کو اس نے ۱۸۱۶ء میں زیر کیا۔ اس کے بعد بمبئی اور مدراس سے فوجیں منگا کر پنڈاریوں کو محصور



کر لیا۔ پنڈاری حکومت نہیں چاہتے تھے۔ صرف لوٹ مار کے عادی تھے۔ اور معاوضہ لے کر مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑے تھے، ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں میدان صاف کر کے امیر خان کو ریاست ٹونک دی۔ کریم خان کو گورکھپور میں ریاست ملی، مگر چیتو فرار ہو گیا، اور چیتے کا شکار ہو گیا، ۱۸۱۹ء تک مرہٹوں سے فیصلہ کیا، ۱۸۲۳ء تک ہندوستان پر تسلط ہو گیا۔ اسی سال ڈائریکٹر کوناراض دیکھ کر استعفیٰ دے کر وہ وطن چلا گیا۔

۱۸۳۱ء میں لارڈ بیٹنگ نے رنجیت سنگھ سے دائمی صلح کا معاہدہ کیا اور شاہ عالم کو قلعہ سے ہٹا کر قطب مینار کے محلوں میں بھیج دیا۔ بہادر شاہ (۱۸۳۷-۵۷ء) کے بعد لارڈ کیٹنگ نے مغلوں کی فرضی بادشاہی بھی ختم کر دی۔ اور ۱۸۰۷ء میں غدر پڑا (۱)۔ کارناوالس نے بڑے عہدوں سے ہندوستانیوں کو محروم کر دیا تھا، جس کی وجہ سے بد امنی ہوئی۔ ویلزی نے کورٹ آف ڈائریکٹر کو لکھا کہ یہ قانونی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے محکوموں میں ہردلعزیزی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ لہذا ان کے قلوب سے نفرت و مخالفت کو دور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے ان کے اختیار، آمدنی اور عزت چھین کر ابھی تک ان کے زخموں کا مداوا نہیں کیا ہے۔ (مکتوب ویلزی مورخہ ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء) جوٹامن اور گیراٹ نے اپنی کتاب **The rise and fulfilment of British rule in India** میں درج کیا ہے۔ مزونے اپنی رپورٹ ۱۲ اگست ۱۸۱۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کو لکھا کہ برٹش گورنمنٹ کی فوجی قوت بغاوت کو دفع کر سکتی ہے۔ بیرونی حملوں کا تدارک کر سکتی ہے۔ اور رعایا کی حفاظت کی ضامن ہو سکتی ہے جو کسی نیٹو ریاست سے ممکن نہیں۔ قانون و اصول ان کی خانگی معاملات کی بھی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ قوت و طاقت بڑی قیمت پر خریدی گئی ہے یعنی اپنے نیشنل کیریئٹر کو فنا کر کے۔ اس لئے اس قوت کو معزز و وقیع نہیں سمجھا جاسکتا۔ برٹش صوبوں کے باشندے بغیر کسی خوف کے اپنے اپنے پیشوں میں مصروف رہ سکتے ہیں اور محنت کے پھل پاسکتے ہیں۔ مگر ان میں

سے کوئی بھی اس وحشیانہ حالت میں رہ کر ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کا مستقبل کچھ نہیں ہے۔ قانون سازی میں ان کا دخل نہیں ہے نہ ان کا کوئی حصہ فوجی و سول ملازمتوں میں ہے وہ محض حاکموں کے حکم کے بندے ہیں لیکن جہاں کوئی حاکم نہیں ہے وہاں ان کی جماعت میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو رہبری کر سکے۔ یہ لوگ پسماندہ ہو کر رہ گئے ہیں، ان کے اخلاق میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لہذا برٹش کی فتح و کامیابی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بجائے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کے یہ لوگ مردہ دل ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے بعد ۱۲ نومبر ۱۸۱۸ء کو پھر لکھا کہ بیرونی فاتحین نے ہندوستانیوں پر سختی کی بلکہ مظالم بھی کئے لیکن ان فاتحین کے برتاؤ سے ہمارا برتاؤ سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔۔۔۔۔ یہ نہ صرف نامہربانی نہیں ہے بلکہ سیاست سے بھی بعید ہے کہ ان لوگوں کے کیریئرز جو ہمارے دست نگر ہیں حد سے زیادہ گرا دیں۔ پھر چند برس کے بعد اس سے بھی زیادہ سخت لکھا (۱)۔ الفسٹون نے لکھا ہے کہ ہم نے ان کے ذہن کو خشک کر دیا ہے اور ہماری فتوحات نے انہیں مردہ بنا دیا ہے۔ اب ان میں نہ علم رہ سکتا ہے نہ ان میں کوئی مجتہد پیدا ہو سکتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ اپنے پہلے والے مورثوں کو بھی بھول جائیں گے۔ مرہٹوں کی جنگ کے آخر میں میلکم نے بھی لکھا ہے کہ ہمارے قانون و آئین بغاوت آفرین ہیں۔ کیونکہ یہاں والوں کے سامنے ان کی موت کھڑی ہے۔ ہمارا سلوک اگرچہ صحیح ہے مگر سخت و سرد ہے۔ اس سے خوف پیدا نہیں ہوتا، مگر خوف کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ لوگ اگرچہ محفوظ ہیں، مگر بیکار و نادار ہیں اور ان سے کوئی ہمدردی نہیں کی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں جان کی امان حاصل ہے۔ مگر ان کی عزت و ناموس خطرے میں ہے اور ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ جس کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ اس کے اخلاق گر جاتے ہیں۔ اور قومی عزت کا پاس جاتا رہتا ہے۔ ان کے گلوں میں طوق غلامی ڈال دیا گیا ہے۔ ہر فرقہ کمزور ہے۔ سانس لینا دشوار ہے۔ ہندو اور مسلمان کی جاگیریں ختم کر دی گئیں ہیں۔ ان کے اسلحہ ضبط کر لیے گئے ہیں۔ ہر

1. REGENOL REYNOLD, THE WHITE SAHIES OF INDIA.

عہدے سے برطرف کر دیئے گئے ہیں اور ان کی سرپرستی و حمایت نہ کر کے کتے کی موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ رہا عام طبقہ تو اس پرنٹیکس لگا دیئے گئے ہیں، سختی سے مالکذاری وصول کی جاتی ہے۔ کسانوں کی زندگی حرام ہو گئی ہے اور اہل حرفہ گورنمنٹ کی پالیسی کی وجہ سے بے زمین کے کاشتکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس مایوس کن حالت اور زمانہ کا تقاضا ہے کہ ان کے سدھارنے کے لئے نیا عنصر پیدا ہو اور وہ حکومت کا نشہ اتار دے۔ (۱)

ڈبلو ڈبلو ہنٹر گو مسلمانوں کا دشمن ہے مگر اس نے اپنی کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی صحیح تشخیص کی یعنی لکھا ہے:

اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزاروں خاندانوں کو بتلائے آفات کر دیا ہے۔۔۔۔۔ ان کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض ادا کرنے کے ذرائع چھین لئے ہیں۔ اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ہمارا بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے ان کے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی شکایتیں ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں۔۔۔۔۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولتوں نے گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔۔۔۔۔ ہنٹر صاحب ہی مسٹر بیلی حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کے سیکرٹری کی رائے نقل کرتے ہیں کہ:-

”کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ (مسلمان) اس طریقہ تعلیم سے پرہیز

1. THOMSON EDWARD: THE MAKING OF INDIAN PRINCES.

کرتے ہیں، جو کتنا ہی اچھا ہو ان کے ملی رجحانات کے خلاف ہے۔ ان کی ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں، یہ طرزِ تعلیم ان کے مفاد کے خلاف اور ان کی مدنی روایات کے منافی ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان۔۔۔ حکومت کے ان عہدوں اور ملازمتوں پر کوئی جگہ نہیں پاتے، جن پر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔۔۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہے وہ بھی تالاں ہیں۔ ان کا یہ احسان ایذا رسانی تک نہیں پہنچتا مگر ان کے مذہبی خیالات کے مطابق لا پرواہی تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ ان کے تعصب کو۔۔۔ یہاں تک برا بیچتہ کیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب باغی کی شکل اختیار نہ کر لے۔۔۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں تک کسی نے بھی مسلمانوں کے متعلق نا انصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا۔۔۔ ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ۔۔۔ اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے، اس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نان جوئی کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا، عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا۔ ان کا انحطاط بھی ہماری ہی سیاسی غفلت و لا پرواہی سے ہوا ہے۔ جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ میں نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا۔ وہ ایسا ہی کھانا کھاتے۔ اور جملہ ضروریات زندگی میں ویسی ہی بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں۔ وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس قومیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت نے تباہ کر دیا ہے۔۔۔ انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں ان کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مختصر ائیوں کہئے کہ یہ قوم وہ ہے جس کی روایات شاندار ہیں مگر جس کا

مستقبل کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ ہو جاتی ہے اور جو شے نقل مکانی کرتی رہتی ہے اس کو ثبات و دوام ہے۔۔۔۔۔ ان تبدیلیوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں، جن سے ۱۷۶۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہوا۔ اس سے مسلمانوں کا سب کا روبرو ہمارے ہاتھ میں آ گیا۔ مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔“

مگر افسوس کہ ہندوستان میں کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی زبوں حالی کو سرکار والا جاہ کے سامنے پیش کر کے دادخواہی کرتا۔ البتہ دور بیٹھے ہوئے غم و غصہ میں بغیر اسباب کے گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھڑکایا گیا اور یہ تجاویز ایسی تھیں کہ باوجود صحیح اور جائز ہونے عوام کے موافق نہ آسکیں، اور کیوں آتیں جبکہ ان کی بیماری دور کر کے روح کو قوی نہیں بنایا گیا مگر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی یہی کوشش تھی کہ پہلے قوت اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور جب ایسا کر لیا جائے تو جہاد کی تیاری کی جائے۔ ان کے بعد جو جہاد کیا گیا وہ طفلانہ جہاد تھا، اور جملہ عیوب سے بھرا ہوا تھا اور بغیر سیاسی حالات کو سمجھے ہوئے محض مذہب کے نام سے کیا گیا تھا۔ اب آخر میں سرسید احمد نے ہنٹر کی پیدا کردہ نفرت کو دور کر کے گورنمنٹ کے سہارے مدرسہ جاری کیا کہ مسلمانوں میں روح پیدا ہو مگر دیوبند کے بعض علماء نے سرسید کی مخالفت کو عین مذہب سمجھا کہ کافر گورنمنٹ سے مدد کیوں لی، مگر آج دیوبند سرکار کی مدح سرائی میں اس درجہ منہمک ہے کہ ایسے اپنے اتحاد کا مطلق خیال نہیں اور اس میں بھی مختلف جماعتیں پیدا ہو گئیں ہیں، مطلب یہ کہ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

گورنمنٹ برطانیہ کی ایک معزز ہستی نے جو کرنل ولزلی اور ڈیوک آف لنکٹن کے نام سے شہرہ آفاق ہے۔ لکھا ہے کہ:-

”برٹش حکومت تلوار کے زور سے قائم ہوئی ہے اور ثبوت یہ دیا ہے کہ جتنے بھی حاکم ہوئے ان میں زیادہ تر سپاہی اور فوجی تھے۔ مثلاً کانالوئس ہیسنگز ہارونگ،

ویلزی، ہیٹنگ، آکلینڈ اور الن برود وغیرہ۔ مگر وہ بیانات جو ان صفحات میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کو انگلشیہ مکاری اور کیادی سے بنایا گیا ہے یا پھر یہ بھی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جان کریا بے صبری میں اس استقلال حکومت کا سہرا شاہ اسماعیل کے سر ہے۔ اس لئے کہ قبل از وقت جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف سے پھیر کر سکھوں کی طرف کر دیا اور اگر وہ اپنی رائے میں حق بجانب تھے تو انہیں یہ بھی مد نظر رکھنا تھا کہ سکھوں کو کمزور کرنے سے انگریزوں کو طاقت پہنچے گی، جب رنجیت سنگھ نے بذریعہ سفارت صلح کی پیش کش کی تھی تو وہ صلح کر لیتے اور اس سے مل کر انگریزوں پر حملہ کرتے، بہر حال ان کے اس کارنامہ جہاد نے وہ کام کیا جو میر جعفر اور میر صادق سے نہ ہوسکا اور مزید یہ کہ شاہ اسماعیل نے مسلمانوں میں ایسی فرقہ بندی پیدا کر دی جس سے توحید کی علانیہ توہین ہو گئی۔ ان کی تو تو میں میں سن کر کوئی ذی ہوش اور صاحب تہذیب اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ گذشتہ سے سبق لے کر حال کو درست کر کے مستقبل کو سنبھالنے کی فکر کی جائے کہ مقصد توحید کی تکمیل ہو سکے۔ یہ اختلاف رائے اور اختلاف عقائد ذاتی معاملات ہیں، ان سے اصلی مقصد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان اختلافات کو بجائے زحمت کے رحمت بن جانا چاہیے۔ یہ فساد پیدا کرنے والے اگرچہ توحید کے مدعی ہیں مگر درحقیقت دشمن توحید ہیں اور نئی نئی اشکال نکال کر فتنے پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ توحید کے معنی علم معقول کے ذریعے سمجھتے ہیں لیکن پائے استدلالیان چوبین و دلہذا زق زق و بق بق میں مبتلا ہیں اور اتحاد کی غلط طریقہ سے عبث کوشش کرتے ہیں۔ توحید کا مفہوم صحیح جذبات و احساسات کی معرفت پر خلوص عمل سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اغراض و نفسانیت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس تحریک میں اضداد و افتراق کا شائبہ ہو وہ پروان نہیں چڑھ سکتی اور اتحاد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

دیکھیں کیا ہوتا ہے آہوں کا اثر ہونے تک

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆



## جہاد

شہنشاہ عالم گیر اورنگ زیب کے بعد جب ہندوستان تباہی میں مبتلا ہوا تو سلطنت مغلیہ سلطنت انگلشیہ بن گئی، غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں پر آفتیں آئیں، ان ہی کو سب سے زیادہ پامال بھی ہوتا تھا، کیونکہ یہ تباہی ان ہی کے کرتوتوں کا نتیجہ تھی، ان کا سب سے بڑا دشمن انگریز تھا، وہ حکومت اپنی قائم کرنا چاہتا تھا، اس نے نہ صرف غیر مسلموں کو برگشتہ کیا بلکہ مسلمانوں میں بھی جو تہ چلوایا اور خوب لڑایا، مظالم کی ان فضاؤں میں مسلمان جان سے بیزار تھے، زمین سخت تھی آسمان دور تھا، خیال تھا کہ پنجاب کے مسلمانوں سے تقویت حاصل ہوگی مگر وہ خود سکھوں کے مظالم سے بے چین و پریشان تھے، مسلمان بادشاہوں نے ہی سکھوں کو پنجاب میں بسایا تھا اور ہر طرح ان کی سرپرستی کی تھی۔

علماء و صوفیاء اپنے مدرسوں اور خانقاہوں سے مردہ تنوں میں روح پھونکنے کی کوشش کر رہے تھے، مردہ قلوب میں شگفتگی کی لہر آ بھی جاتی تھی مگر قیام و سکون کی کوئی صورت نہ تھی، جب سید احمد بریلوی کا قافلہ زیارت حرمین سے واپس آیا تو وہ اپنی کارگزاریوں پر نازاں تھا۔ اس نے اپنی للہیت کی بنا پر سینہ ٹھونکا اور اپنے ملتوی کردہ جہاد کی تبلیغ شروع کر دی کہ ہندوستان نمونہ سقر ہے، یہاں سے ہجرت کر کے پنجاب جانا چاہیے، پھر وہاں کے مسلمانوں کو بھی سکھوں کی دستبرد سے نجات دلا دیں گے۔ یہ اقدام بڑی جرأت کا کام تھا مگر انہیں فخر تھا کہ تبلیغی دوروں کے ذریعہ ضائع شدہ قوتوں میں روح پیدا کر چکے ہیں، سفر حج میں درخشاں کامیابی حاصل کی ہے، لہذا ہجرت اور

جہاد کا اعلان کر دیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے تبلیغی دوروں سے اتحاد کے بجائے اختلاف پیدا ہو گئے اور سفر حج میں تنازعات کی وجہ سے تیار حج چھوڑ کر واپس آنا پڑا تھا۔ یہ بہر حال ان کی شانِ بے نیازی نے ان کو ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا، اور ذوق و شوق میں بغیر زمان و مکان اور اونچ نیچ کا لحاظ کئے ہوئے ہجرت و جہاد کی طے کر لی۔

تذکرہ نویسوں نے جہاد کی داستانیں جو لکھی ہیں ان سے تنگ نظری نکلتی ہے اور وسیع النظری کا کسی طرح پتہ نہیں چلتا، کاش وہ زمان و مکان کو پیش نظر رکھتے تو بات بن جاتی۔

نواب صاحب بیر ستر امر و ہوی کا شعر ہے:

ہر زمانہ کا اک فسانہ ہے

ہر فسانہ کا ایک زمانہ ہے

اور مکان کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے:

حاکم کے کابل میں آم کا پودا

گمبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

مقصد نصب العین مستقل رہتا ہے مگر وقت و مقام کی وجہ سے اس کے حصول

کا طریقہ بدل جایا کرتا ہے، وہی بات شمال میں ایک طریقہ سے حاصل ہوتی ہے اور

جنوب میں دوسرے انداز سے، ایک زمانہ تھا کہ لڑائیوں میں تیرو تیغ سے کام لیا جاتا تھا

مگر آج توپ و ٹینک اور ایٹمی اسلحہ ان کے قائم مقام بن گئے ہیں، موجودہ دور میں

انجنیئروں نے سبک اور خوبصورت عمارتیں بنائی ہیں مگر پہلے والے محلوں کی بنیادیں

شکلین ہوتی تھیں، اور دیواریں کیم شحیم قلعوں کی مانند بنائی جاتی تھیں، کون نہیں جانتا

کہ صبح بنارس، شام اودھ اور شب وروز مالوہ و کشمیر کس قدر روح افزا ہوتے ہیں مگر

دو پہر کو ان میں ناگوار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، موسم گرما میں یہ سب جھانسی اور ایبٹ

آباد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بارش کے وقت چیرا پونجی بن جاتے ہیں، معلوم

ہوا کہ اصولوں کی تعمیل میں وقت و زمانہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، قرآن پاک خود اپنی

تذیل سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، صحیح حدیث ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایمان تالاب کے کناروں کے جھاگ کی طرح ہوگا کہ جلد بنتے ہیں اور بگڑ جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زمان و مکان سے جو فائدہ اٹھالے وہی میر کا مران و کامیاب ہے، یہاں یہ اصحاب ہر بنیاد غلط، ترغیب جہاد اور فراہمی اسباب کے لئے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے ایک سال دس ماہ کے اندر اپنے جھنڈے کے نیچے پانسو چھ سو مجاہد جمع کر لئے۔

ان حضرات کی تبلیغ کا رنگ ڈھنگ نیا تھا، اصلاح رسوم کے انداز نرالے تھے اور ادائیگی حج بھی امتیازی شان رکھتی تھی۔ اب اس ہجرت و جہاد کو بغیر کسی ظاہری اسباب و سامان کے کرامت ہی خیال کیا جاسکتا ہے، معتقدین و مریدین کو یقین تھا کہ دوران حج میں سید صاحب کو الہام ہوا ہے کہ پشاور سے تادریائے ستلج کا ملک بھی سید صاحب کے اثر سے ہندوستان کی طرح رشک چمن ہو جائے گا۔ (۱) اس پر اگر کسی کو شک ہو تو آئندہ کے الہامات نے مکرر وسوسہ کرر اطمینان دلا دیا کہ ”۔۔۔ میرے رب نے مجھے وعدہ واثق کرایا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ سے پورا کر کے مجھے مارے گا۔“ فقیر دریں باب بشارت غیبی مامور است و بہ بشارت لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شبہ و وسوسہ شیطانی و شائبہ ہوانفسانی بایں الہام ممتنع نیست“ (۲)

اب کون تنفس ایسا تھا جو یقین نہ کرتا، خوشا وہ قوم جس کا نصب العین اعلاء حق اور رضائے خدا ہو، بہر حال نہایت خلوص سے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو بہ عمر چالیس سال قدم اٹھا دیا، اس میں توکل و تدبر دونوں شامل تھے، خادمہ سے تہہ خانہ میں سے دس ہزار روپے نکلوائے، پانچ ہزار بیویوں کو دیئے اور بقیہ پانچ ہزار چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں سلوا کر غازیوں کی کمر میں باندھ دیئے۔ اس وقت یہاں غازیوں کی تعداد چھ سو بہت کم تھی مگر یاغستان میں یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی، اس بے سرو سامانی میں عزم و ایمان کی

۱۔ سوانح احمدی اور مہر صاحب کی سید احمد شہید ۲۔ جملہ تذکرہ جات

قوت سے ساڑھے چار برس سکھوں کے چھکے چھوڑا دیئے اور وہاں کے مسلمانوں میں صحیح و غلط کا امتیاز کر کے دکھا دیا، سکھوں نے تنگ آ کر صلح کی درخواست کی مگر جذبہ ایمانی کی تقویت پر مسترد کر دی، اس کے بعد مقامی حکومتوں اور روساء نے سکھوں سے ساز کر لیا اور سید صاحب کی مخالفت کی، وہاں کے مسلمانوں کے فریب و دغا کی وجہ سے الہام غلط ٹھہرا اور نتیجہ وہ ہوا جو تاریخ میں موجود ہے۔ اس طرح وہ دنیا کو ایسا سبق دے گئے جو قیامت تک نہیں بھلایا جاسکتا، اتنے بڑے لشکر کا انتظام کرنا معمولی بات نہ تھی، جیسی جیسی ضرورت پڑتی گئی، ویسے ویسے اصول بناتے رہے، اب اگر بد انتظامی کی وجہ سے کسی کو تکلیف ہوئی تو مرضی الہی سمجھ کر صبر کر لیا۔

لاہور فتح کرنے کے لئے سید ہارا راستہ براہِ دہلی بعد عبور دریائے ستلج تھا، مگر ۱۸۰۹ء میں انگریزوں اور سکھوں سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ دونوں کے درمیان دریائے ستلج حد فاصل رہے گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے، سید صاحب نے یہ راستہ اس لئے اختیار نہیں کیا کہ انگریزی عمل داری میں خلل پڑے گا اور راہِ دراز یوں پسند کی کہ درمیانی بستیوں اور ریاستوں کو جہاد پر آمادہ کر لیں گے، پھر بخارا، ایران اور ترکستان سے بھی مدد مل سکے گی، اس سفر کی ابتدائی منزلوں کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے مولانا غلام رسول مہر صاحب نے حکم رائے لکھی ہے کہ سید صاحب نے ٹونک یا اجمیر، شکار پور پنچے، گوالیار میں پنڈاریوں والے رفیق غلام حیدر کو سب سے پہلے سید صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اور ان ہی کی وجہ سے وہاں شاندار استقبال ہوا۔

مہاراجہ کے سالے اور وزیر راجہ ہندورائے نے سید صاحب کو موتیوں کا ہار اور چغندر کیا، مہاراج خود ادب سے حاضر ہوئے اور مہارانی نے اصرار کیا کہ ان کے خاص محل میں قیام فرمائیں، لیکن سید صاحب نے معذرت کر لی، افغانستان کے ایک شاہزادے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے وہ اس قدر گرویدہ ہوئے کہ احترام اپنی

صاحبزادی کو سید صاحب کی خدمت میں زوجیت کے لئے پیش کیا، مگر سید صاحب نے اپنے بھتیجے یا بھانجے کے لئے اسے قبول فرمایا، یہاں دس دن کے قیام میں لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا، اس کے بعد ٹونک میں نزول اجلال فرمایا، یہاں قیام ایک مہینہ سے کچھ زائد رہا، سب سے پہلے نواب امیر خاں کو ایک عربی گھوڑا مرحمت کیا، پھر انہیں مرید کیا، نواب نے دل کھول کر تواضع کی اور مستقل مدد دینے کا یقین دلایا، ٹونک کے قیام میں ایک عجیب کرامت ظاہر ہوئی، سید صاحب کے محبوب مرید میاں الطاف پروچی نازل ہوتی تھی، شاہ اسماعیل نے بڑے طوم و طراق سے سید صاحب کے مناقب میں لکھا ہے کہ یہ مرتبہ سید صاحب کی عنایت سے میاں الطاف کو حاصل ہوا تھا، وہ روزانہ حلقہ قائم کرتے تھے اور اپنی چادر میں سے نکال کر سید صاحب کو اور حاضرین کو بہشتی میوے دیا کرتے تھے، ایک روز سید صاحب کے بھانجے سید حمید الدین کو ایک چھواری عنایت کیا، اس میں کیڑے تھے تو سید حمید الدین نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تمسخر کے ساتھ سب کو بتایا کہ بہشتی میوؤں میں بھی کیڑے ہوا کرتے ہیں، سید صاحب نے اس گستاخی پر بھانجے صاحب کو تنبیہ فرمائی، دوسرے دن حمید الدین صاحب نے بہشتی میوؤں کی تقسیم کے وقت میاں الطاف کے جسم سے ان کی چادر گھسیٹ لی، کرامت یہ کھلی کہ ان کی رانوں کے بیچ میں میوؤں کی تھیلی رکھی ہوئی تھی، لہذا وہ خبیث و ذلیل و خوار ہوا۔ (۱)

نواب وزیر الدولہ رقمطراز ہیں کہ ٹونک سے اجمیر تک میں سید صاحب کے ہمراہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ سید صاحب کبھی ایک طرف کو منہ پھیر کر سلام کرتے ہیں اور کبھی دوسری طرف گردن موڑ کر سلام کا جواب دیتے ہیں اور بعض اوقات سوال و جواب کی بھی نوبت آ جاتی ہے، یہ گفتگو جنات یا رجال الغیب سے ہوتی تھی، سید صاحب نے تشریح فرمائی تھی کہ ایک جماعت رجال الغیب کی من جانب اللہ سفر و حضر

۱۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے سیف الجبار میں اس کرامت کو لکھا ہے اور اس کتاب کی اشاعت تک میاں الطاف بہ قید حیات تھے۔

میں ہمارے ساتھ رہتی ہے، جس جگہ ترویج ہدایت باری تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ جماعت قدسیہ کثرت سے جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ رب العزت کو ہدایت کم کرنا ہوتی ہے تو یہ جماعت قدسیہ کم ہو جاتی ہے، دوسرا حال اس جماعت قدسیہ کا یہ ہے کہ ہمارے مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے فاصلہ پر اترتی ہے اور جب ارادہ الہی ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اس طرف کوچ کرنے لگتی ہے، پھر اس سمت کو ہم بھی چلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی جگہ زیادہ قیام کرنا پڑتا ہے اور کسی جگہ کم، اجمیر میں چند روز قیام رہا مگر سید صاحب حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں نہیں گئے، کھنڈیار پر جو وہ پور کی حد ختم ہوئی اور سندھ میں داخلہ ہوا، حاجی عبد الرحیم فاطمی کو پروانہ راہداری حاصل کرنے کے لئے عمر کوٹ بھیجا مگر نائب قلعہ اربے رخی سے پیش آیا اور اجازت نہیں دی، کھادرہ میں اونٹ گم ہو گئے تو ان کی تلاش کے لئے شاہ اسماعیل چھوڑ دیئے گئے، کارو میں چورن شاہ نے امیران سندھ کو سفارش لکھی، چناچہ حیدرآباد میں خیر مقدم کیا گیا، یہاں سے بہاولپور کو درخواست بھیجی مگر مسموع نہیں ہوئی اور نہ یہاں کسی نے استقبال کیا، رانی پور میں سومریوں کے ساتھ سید صبغۃ اللہ راشدی ملاقات کو آئے، ان کی جماعت حرخود جہاد کی مبلغ تھی مگر راستہ مسدود ہونے کی وجہ سے وہ سید صاحب کے جہاد میں شرکت نہ کر سکے، ان کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر سید صاحب نے اپنے اہل و عیال کی بودوباش کے لئے پیرکوٹ (پیرجو گوٹھ) کو پسند کیا، شکار پور والوں نے اول اول سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھا مگر بعد کو خاطر تواضع کی، وقت رخصت سید صاحب نے میر کاظم علی کو گھوڑا نذر کیا اور انہوں نے جواب میں اونٹنی دی جو کابل تک ساتھ رہی، میر صاحب نے جہاد میں شریک ہونے کا وعدہ کیا تھا مگر باوجود کئی مرتبہ بلائے جانے کے شریک جہاد نہ ہو سکے اور ثواب سے محروم رہے، اب بلوچستان کے حدود شروع ہوئے، یہاں بھی انگریزوں کے جاسوس ہونے کا شبہ کیا گیا، لیکن کوئٹہ میں استقبال کیا گیا اور وہاں



کے رئیس نے بیعت بھی کی، چھتر پہنچے تو حاکم ولی محمد کی معرفت محراب خاں کو دعوت دی، یہاں بھی اہل و عیال کے ٹھہرانے کے لئے خواہش ظاہر کی، یکم محرم ۱۲۴۲ھ کو دھار پہنچے، یہ درہ بولان کا جنوبی دھانہ ہے، اس کو پار کر کے قندھار آئے، یہاں کے حاکم پر دل خان کو ان کی بے مائیگی پر سخت حیرت ہوئی مگر قندھاریوں نے زور شور سے عقیدت کا اظہار کیا، حاکم نے کہلا بھیجا کہ آپ کے اجتماع کی وجہ سے انتظام میں خلل پڑتا ہے لہذا یہاں سے تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد سید صاحب نے قلعہ اعظم پور جا کر قیام کیا، یہاں خود بخود چار سو قندھاری آگئے تو سید صاحب نے حاکم سے اجازت لے کر دوسو ستر کو ساتھ لے لیا اور بقیہ سے وعدہ کر لیا کہ بعد کو بلا لیا جائے گا، آگے بڑھے تو غلزیوں کا دعوت نامہ ملا مگر اس کا جواب نہیں دیا، جلدک میں غلزیوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم چالیس پچاس ہزار سواروں سے شرکت کریں گے لیکن سید صاحب نے نہ ان سے بیعت لی اور نہ ان کی درخواست قبول فرمائی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ناقابل اعتبار تھے اور پشاور والوں سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے، مشکئی سے روساء غزنی و کابل کو خط لکھے، غزنی میں دو روز قیام کیا وہاں سب نے بیعت کی، جب کابل سے پروانہ آ گیا تو وہاں کارخ کیا، کابل کے حاکم سلطان محمد خاں نے شہر کے دروازے پر آ کر پیشوائی کی، ان لوگوں نے سکھوں سے بیزار ہونے کی وجہ سے سید صاحب کو فرشتہ رحمت سمجھا، مگر قدسی جماعت کی قلت و بے سروسامانی دیکھ کر ان کے دل افسردہ ہو گئے، شاید عقائد کے اختلاف بھی بے دلی کا باعث ہوئے ہوں، یہاں ۴۵ دن کے قیام میں سرداروں کے اختلاف دور کرنے کی کوشش کی مگر دور نہ کرا سکے، بہر حال اس پورے سفر میں خاطر و مدارت ہوئی، سب نے بیعت بھی کی، لیکن ریاست ٹونک کے علاوہ کسی نے مدد نہیں کی، ہر جگہ لشکر کی قلت کی وجہ یہ بتائی کہ سب کو ساتھ لانا مشکل تھا، رفتہ رفتہ مجاہدین کے قافلے آتے رہیں گے، چنانچہ بعد میں ہندوستان سے چھ قافلے آئے، جن میں مجاہدین کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تھی، قافلوں





لیکن رضا پہ قضا کا معاملہ تھا، نالے کا پانی بند ہو گیا تو تین چکیاں بیکار ہو گئیں، لہذا ادنیٰ چکیاں خریدنا پڑیں اور غازی خود آٹا پیسا کرتے تھے، کلکتی میں شاہ اسماعیل وغیرہ کو دو روز کے فاقے ہوئے، درانیوں کے خلاف ہو جانے کی وجہ سے پشاور کے ساہوکاروں نے ہنڈیاں لینے سے انکار کر دیا تو بڑی مشکل سے منارہ کے ساہوکاروں سے تبادلہ کا انتظام کرنا پڑا۔ خیبر کے قیام میں عسرت کا یہ عالم تھا کہ غازی گنے چھیل کر گذر کرتے تھے، ایک روز پیش قبض کی کفالت پر بنیے سے چاول لئے اور منارہ کے بزازوں سے کپڑے خریدے، خشکی اور بد حالی دیکھ کر یہاں کی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ سید صاحب کے ساتھی یا تو خواہش نفس سے محروم ہیں یا پھر اولیاء ہیں، زندگی کے یہ اطوار تھے مگر ہنسی خوشی سب برداشت کر لئے جاتے تھے۔ عالی ہمتی یہ تھی کہ غازیوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا، جب زیدہ کی جنگ کا مال غنیمت تقسیم کیا گیا تو غازیوں نے اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا، بدیں وجہ کہ خرچ جو بیت المال سے ملتا ہے وہی کافی ہے، البتہ بعض غازیوں نے فوری ضرورت کی کچھ چیزیں لے لی تھیں، یہ سب انہیں اس لئے گوارہ تھا کہ اسلام کو دور اول میں جو برتری حاصل تھی وہ خدمت دین کا ثمرہ تھی، دور اول میں جذبہ جہاد کی روح پیدا ہو گئی تھی، سب کو یقین تھا کہ تبلیغی دوروں اور سفر حجاز کے بعد دور اول کی ایمانی فراست حد کمال کو پہنچ چکی ہے۔

اس زمانہ میں جب کہ سید صاحب جہاد کے لئے روانہ ہوئے، سکھ بارک زیوں کی لڑائیوں کی وجہ سے خستہ و پریشان تھے اور رنجیت سنگھ خود امرتسر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ (قدھار، غزنی، کابل، پشاور، کوہاٹ اور ہشت نگر میں بارک زیوں کی حکومت تھی) سید صاحب نے جاتے ہی اسلامی اصول کے مطابق بمقام لاہور اعلام نامہ بھیجا، جواب نہ ملنے پر معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ دس ہزار فوج لے کر خیر آباد (صوبہ سرحد) پہنچ گیا ہے، امیر خاں خٹک نے مشورہ دیا کہ اگر بدھ سنگھ نے دریائے لنڈ عبور کر لیا تو سمہ میں قتل و غارت کرے گا اور وہاں والے آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، لہذا پیش قدمی کر کے اسے روک دینا چاہیے اور نوشہرہ پہنچ کر اس سے مقابلہ کیا جائے، یہ امیر خان سید صاحب کا معتقد و رفیق نہیں تھا، چونکہ اس کا بھتیجا سکھوں کا طرف دار اسی کی

ضد پراس نے ایسا مشورہ دیا تھا۔

## جنگ اکوڑہ

سید صاحب با حال تباہ چارسدہ میں ایک مہینہ قیام کر کے خویشتگی تشریف لے گئے، ان کا لشکر پندرہ سو غازیوں پر مشتمل تھا، جس میں پانسو ہندوستانی، دو سو ستر قندھاری اور باقی ملکی و مقامی غازی تھے۔ اٹک سے تین میل خیر آباد ہے، وہاں سے پانچ میل جہانگیرہ روڈ ہے، پھر تین میل کے بعد شیدو ہے اور اس کے بعد اکوڑہ ہے، سید صاحب ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء کو روانہ ہوئے، ۱۹ دسمبر کو ڈیرہ پھردن چڑھے نوشہرہ میں داخل ہوئے، بدھ سنگھ اکوڑہ پہنچ چکا تھا، سید صاحب نے شب خون کی تیاری کی، اس پر بدھ سنگھ نے لکھا کہ اگر بہادر ہو اور سید ہو تو سامنے آ کر لڑو، مگر یہ اس کی چال میں کب آنے والے تھے، رات کے تین بجے جب سکھ کھلے میدان میں سو رہے تھے، شب خون مارا گیا، سکھ سر اسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے، کامیابی سمجھ کر سرحدیوں نے مال لوٹنا شروع کر دیا، صبح ہوتے جب غازی واپس ہوئے تو سکھوں نے تعاقب کیا، سکھوں کا مالی و جانی نقصان بہت ہوا، غازی تیس کے قریب شہید ہوئے اور شاید اسی قدر زخمی ہوئے، سید صاحب کو اس کا بے حد رنج ہوا اور اس کو نقصان عظیم سمجھتے تھے، بدھ سنگھ بھاگ کر شیدو چلا گیا، سید صاحب نے اپنی پہلی کامیابی کا مژدہ ہندوستان کو لکھ بھیجا اور امیر دوست محمد خان کو بھی خوش خبری سنادی (۱) اب اہل سرحد جوق در جوق بیعت کے لئے آنے لگے کیونکہ اس فتح سے اجنبی تسلط سے نجات کی امید ہو گئی تھی۔ (۲) خاویہ خان رئیس ہند نے تعاون میں سبقت کی، اشرف خان رئیس زیدہ نے بھی بیعت کی، سید صاحب ہند تشریف لے گئے اور اسے اپنا مرکز بنایا، اس سے پہلے نوشہرہ میں قیام تھا، سرحد والوں کی تعداد پانچ ہزار تک ہو گئی، ہندوستانی و قندھاری اتنے ہی رہے جتنے تھے، جوش و خروش میں معتد بہ ترقی ہوئی، مگر عملی تعاون کے لئے لوگوں نے قدم بہت کم اٹھائے۔ (۳)

۱۔ سوانح احمدی، صفحہ ۱۰۲ ۲۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر ۳۔ ایضاً

## جنگ خضر و بازار

عرض کیا گیا کہ خضر و بازار بڑی منڈی ہے، یہاں سے مال زیادہ ملنے کی امید ہے اس پر قبضہ کر لیا جائے، سید صاحب نے اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھا کیونکہ جنگ اکوڑہ میں نقصان عظیم ہوا تھا، لیکن اجازت دی کہ تم لوگ اس شرط پر کہ کسی مسلمان کو گزند نہ پہنچے حملہ کر سکتے ہو، چنانچہ ملکوں کے تیس چالیس قندھاری بھی ساتھ ہو گئے، قندھاریوں نے گڑھی پر قبضہ کیا اور سرحدیوں نے منڈی کو لوٹا، سرحدی سامان لے کر واپس آرہے تھے اور قندھاری پیچھے سے ان کی حفاظت کر رہے تھے تو چند روز میں سکھوں نے ان کا تعاقب کیا، قندھاری ان سے جٹ گئے، سرحدی بھاگ کھڑے ہوئے جن میں سے گھبراہٹ میں کچھ دریا غرق ہو گئے، اتنے میں پانسو سکھ آ گئے، سید صاحب نے ملکوں کو حکم دیا کہ قندھاریوں کی مدد کریں، ان کے ساتھ چند ہندوستانی بھی بغیر اجازت چل دیئے، غازیوں کو دیکھتے ہی سکھوں نے راہ فرار اختیار کی، غازی کشتیوں میں واپس آرہے تھے کہ سکھ پلٹ پڑے اور گولے پھینکے گئے، اب سید صاحب خود بہ نفس نفیس تشریف لے گئے، ان کو دیکھتے ہی سکھ ایسے غائب ہوئے جیسے شیطان لا حول سے بھاگ جاتا ہے، مال غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، خادی خان کے فیصلہ کو نہ سرحدیوں نے مانا نہ قندھاریوں نے، سید صاحب نے فیصلہ دیا کہ جو مال جس کے پاس ہے وہی لے لے، دو تین دن کے بعد تین ہزار سکھوں نے دریا پر آ کر شاہین چلائیں تو اشرف خان کو ان کے دفع کرنے کو کثیر لشکر کے ساتھ بھیجا، مگر گولوں کی شدت کی وجہ سے سرحدی نہ ٹھہر سکے، جب ملکوں نے وسط دریا سے گولیاں ماریں تو سکھوں کو بھاگ جانا پڑا۔

سرحدیوں کی بے قاعدگیاں، دشمنیاں اور لوٹ مار کے مد نظر نظم جمعیت کی خاطر ۱۳ جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء کو ہند کے تالاب کے کنارے سید صاحب کو امیر منتخب کیا گیا، یہ امارت محض تنظیم جہاد کے لئے تھی، اس کا ریاستوں کے انتظام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ آپس کے اختلافات کو دور کرنا اصل مدعا تھا، مگر اس کے پردے میں اختلافات نے اور بھی سر نکالا، جب یہ امارت ناقابل تسلیم ٹھہری تو سب سے پہلے



فتح خان نے سید صاحب کی امامت کی بیعت کی، پھر روساء پشاور نے بذریعہ تحریر قبول کی، لیکن وہ اس وجہ سے ناقابل اعتبار سمجھے گئے کہ رنجیت سنگھ سے بے حد دبے ہوئے تھے، بہر حال جب جمعیت اسی ہزار کی ہو گئی تو طے کیا گیا کہ نوشہرہ پر سکھوں سے مقابلہ کیا جائے۔

## جنگ شیدو

شیدو میں سید صاحب یار محمد خان درانی کے یہاں مہمان ہوئے، صبح کو جنگ ہونے والی تھی، رات کے کھانے میں سید صاحب کو زہر دیا گیا، میدان میں جانے کے لئے شاہ اسماعیل صبح کو جب آئے تو سید صاحب کی حالت غیر تھی، اسی حالت میں سید صاحب میدان جنگ میں لے جائے گئے۔ ان کے پہنچتے ہی درانیوں اور سمر والوں نے راہ فرار اختیار کی اور ساتھ چھوڑ دیا، بڑی مشکل سے سید صاحب کی جان بچا کر انہیں چند لٹی لے جایا گیا، ساتویں دن جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا، یہ سب کچھ میری خطاؤں کی وجہ سے ہوا، تکلیف کے بعد اللہ راحت دے گا۔ (۱) یہ صحیح ہے کہ یار محمد خان نے سکھوں سے سازش کر لی تھی لیکن مومنوں کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں۔

اب سید صاحب نے بنیر اور سوات کا دورہ کیا اور خوب جوش کے ساتھ تبلیغ کی، ہندوستان کو داعی بھیجے، پترال، کشمیر اور بخارا کو بھی دعوت نامے لکھے، دو مہینوں کے بعد اوائل ذوالحجہ میں دہلی سے مولوی عبدالحی آ گئے، اس دوران میں عسرت انتہاء کو پہنچ گئی تھی، مگر غازیوں نے دست سوال دراز نہیں کیا، البتہ امداد قبول کر لی، پنج تار کے فتح خان نے غلہ سے مدد کی، ہندوستانی قافلے اپنے ساتھ روپیہ بھی لاتے تھے، پہلا قافلہ ۲۷ اپریل ۱۸۲۷ء کو چنگلپتی میں آیا، اس وقت قندھاریوں کے علاوہ ساتھ سو غازی ہندوستان کے تھے، یہاں سے سید صاحب پنج تار گئے، پھر کچھ دن خیبر میں قیام فرمایا اور جنوری ۱۸۲۹ء تک درانیوں کے خرنشے اور دغدغے کو دور کیا، شاہ پترال نے جوڑکی نذر کی تھی اس کا نام فاطمہ تھا، زہر کا اثر دور کرنے کے لئے سید

۱۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

صاحب نے اس سے نکاح کر لیا (۱) خیر سے واپس آ کر مستقل طور پر بیچ مار کو مرکز بنایا (۲) یہ تبدیلی خادی خان کو ناگوار ہوئی، ہنڈ میں سکھوں کے حملے کا خوف رہتا تھا اس لئے مرکز کی تبدیلی ضروری سمجھی گئی تھی، ہر چند یہ تبدیلی بر بنائے مصلحت ہو مگر ضعف کی علامت سمجھی گئی، اس عرصہ میں شاندار تبلیغ کی وجہ سے دعوت جہاد کی قبولی و پذیرائی خوب ہوئی، حملہ خوانین نے اطاعت قبول کی اور سکھوں کے خلاف زبردست محاذ تیار ہو گیا۔ والی چترال نے گلگت کے راستہ سے مدد دینے کا وعدہ کر لیا، لہذا اچھلی (ہزارہ) کی طرف جہاد کے امکانات قوی ہو گئے۔ (۳) سید صاحب کو اتنی کامیابی کی امید نہیں تھی، ستمبر ۱۸۲۷ء میں شاہ اسماعیل کو ہزارہ بھیجا، امب اور اگروڑ میں تبلیغ کر کے ہزارہ کو فتح کرنے کی کوششیں کیں مگر کوئی صورت نہ نکل سکی (۴) صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ ڈمگلہ اور شنبہاری پر معرکے کیوں ہوئے، گڑھی میں حبیب اللہ خان کا لڑکا بند کر لیا گیا تھا، غازیوں کی آمد کی خبر سن کر سکھوں نے گڑھی سے محاصرہ اٹھا لیا اور حبیب اللہ خان کا لڑکا ان کی قید سے آزاد ہو گیا، ڈمگلہ کے شیخوں میں تقریباً چار سو ملکوں نے علیحدگی اختیار کر لی مگر جب سنگھ کے باہر سکھ نکال دیئے گئے تو علیحدہ ہو جانے والے ملکی آملے اور لوٹ مار میں شریک ہو گئے، اس کے بعد سکھ تیار ہو کر آئے تو مراجعت کرنا پڑی، شنبہاری میں کھیت کاٹنے کے لئے سکھ جارہے تھے، شاہ اسماعیل نے حملہ کر دیا اور سکھ بھاگ گئے، اس حملہ میں شاہ اسماعیل کی چھنگلی کو شہادت نصیب ہوئی، ہندوستان سے آنے والے قافلوں کو درانی وق کیا کرتے تھے لہذا شاہ اسماعیل بھیجے گئے تاکہ درانیوں سے ملامت کریں، چنانچہ شاہ اسماعیل نے جولائی ۱۸۲۷ء کو سلطان محمد خان کو خط لکھا اور ان کے شرک و دفع کر دیا۔

مولوی محبوب علی دہلی سے جہاد میں شریک ہونے کے لئے آئے مگر یہاں کے حالات دیکھ کر بدل برداشتہ ہو گئے اور واپسی کی ٹھہرائی، ان کے ساتھ کچھ اور بھی مجاہدین ہزاری کی وجہ سے واپس ہوئے، اب سید صاحب نے سہ اور خیر کا دورہ کیا، پھر شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء کو مولوی عبدالحی کا خیر میں انتقال ہوا، اس عرصہ میں

۱، ۲، ۳۔ "سید احمد شہید" از غلام رسول مہر

سید صاحب کو تنخواہ دار مجاہدین رکھنا پڑے، دو ماہ کے بعد ان کی تنخواہ دے کر انہیں برخاست کر دیا۔ خیبر میں قیام دسمبر ۱۸۲۸ء یا جنوری ۱۸۲۹ء تک رہا، درانیوں کی منافقت اور مخالفت دور کرنے کے لئے مئی ۱۸۲۸ء میں پیش قدمی کی گئی، اس جنگ تمازی (عثمان زئی) میں وہاں کے رئیس کا لڑکا درانیوں سے ساز کر گیا، اس لئے غازیوں کو واپس آنا پڑا۔

دو سال بعد ۲۵ شعبان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۳۹ء کو اقامت شریعت کی بیعت کا نسخہ ایجاد کیا گیا تاکہ یہاں کے لوگ شرع کی پابندی کریں اور بیعتوں کی تعمیل کو فرض سمجھیں، اس اجتماع میں علماء کے علاوہ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں (زیدہ) اور خاوی خاں (ہنڈ) موجود تھے، انہوں نے اقامت شریعت کی بیعت بھی کی تھی، اس جدید بیعت کا اصل مقصد یہ تھا کہ شرعی احکام کو نفاذ ہو، اس طرح حکومت الہیہ کی بنیاد رکھ دی گئی، اس سے اختلافات میں اور بھی زیادہ ترقی ہوئی، شرعی احکام کی تعمیل ناروا سختیوں کے ساتھ کی گئی اور مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا۔

نظام شرعی کے سلسلہ میں قصبہ مانیر کا جھگڑا طے کیا گیا، نوے برس ہوئے تو مانیر کے باشندوں کو نکال کر غاصبوں نے قبضہ کر لیا تھا، اب اس مسئلہ کو اٹھایا گیا، باشندوں کے طرف دار زیدہ کے اشرف خاں تھے اور غاصبوں کے حمایتی خاوی خاں ہنڈ والے تھے، شرعی فیصلہ ہوا کہ قدیم باشندوں کو حق دلایا جائے، یہ فیصلہ بزور شمشیر منوایا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اشرف خاں اور خاوی خاں میں ٹھن گئی، سید صاحب ان دونوں میں صلح نہ کرا سکے، آخر کار جب خاوی خاں کو شکست دے کر اشرف خاں اترتے ہوئے گھوڑے پر آ رہے تھے کہ سید صاحب کو خوش خبری سنائیں تو گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، راکب و مرکوب دونوں گرے اور اشرف خاں جاں بہ حق ہو گئے، اشرف خاں، خاوی خاں کے خسر تھے، اشرف خاں کی وراثت کا جھگڑا بھی چونٹیوں بھرا کباب تھا، خاوی خاں، اشرف خاں کے لڑکے کے مقرب خاں کے لئے کوشاں تھا، سید صاحب نے دوسرے لڑکے فتح خاں کے حق میں فیصلہ کیا، اس فیصلہ کی وجہ سے خاوی خاں سید صاحب سے منحرف ہو گیا اور میجر و نورا سے سید صاحب پر اعتراض کروایا کہ آپ اس

ملک میں کیوں دخل انداز ہوتے ہیں، سید صاحب نے مولوی خیر الدین کی معرفت جواب دیا کہ یہ ملک خالصہ جی کا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے، اس گفتگو میں میجر اور مولوی میں تیزی پیدا ہو گئی، لڑائی کی نوبت آنے والی تھی مگر ورتورا اپنا اسباب تک چھوڑ کر بھاگ گیا، عام طور پر سمجھا یہی گیا کہ اقامت شریعت والی بیعت کے سبب دینی فضا خوشگوار ہو گئی ہے اور امن قائم ہو گیا ہے، لیکن خدا جانے واقعات کو کیا دشمنی ہے کہ ان سے ان افسانوں کی تائید نہیں ہوتی۔

سید صاحب نے سکھوں کے قبضہ سے انک کو خالی کرانے کا وعدہ کیا تھا، تجویز یہ ہوئی کہ غازی برات کا جلوس بنا کر شہر میں داخل ہو جائیں اور تسلط جمالیں، اتفاق سے یہ راز فاش ہو گیا، کچھ غازی گرفتار کر لئے گئے اور کچھ نے بھاگ کر امان زئی میں سید صاحب کو یہ خبر سنائی، شرعی احکامات کی تعمیل کے غلط نتائج دیکھ کر پنجتار میں ۶ فروری ۱۸۲۹ء کو علماء کا اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ جو امام کے حکم سے سرتابی کرے گا، اسے باغی سمجھا جائے گا اور باغی کی سزا قتل ہے، اس تین ہزار کے مجمع میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ بصیرت افروز ہے، فرمایا کہ مجھ کو جناب باری سے ارشاد ہوا کہ دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دارالامان پنجاب میں جا اور کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کر، ہندوستان میں اس لائق کوئی جگہ نہیں ملی، لوگوں نے کہا کہ ہندوستان میں جہاد کر، ہم ہر طرح سے مدد کریں گے اور سامان دیں گے، یہ مجھ کو منظور نہیں ہوا، اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے ہونا چاہیے، ہمیں بلوہ کرنا منظور نہیں ہے۔ (۱)

امب کے ولایتوں نے اپنے ملک کو پیش کیا کہ سب مسلمان شریک ہوں گے، رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے، تو ہین اسلام کرتا ہے، اذان تک کی ممانعت کر رکھی ہے، مسجدوں میں گھوڑے باندھے جاتے ہیں اور گاؤں کشتی بھی بند کر دی ہے، اس پر میں نے کہا کہ بہتر ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چلیں اور مسلمانوں کو متحد کر کے کفار سے جہاد کریں، پھر علماء سے خطاب کیا کہ آپ نے ہمیں جگہ دی، بیعت امامت کی، آپ کے مشورہ کے مطابق جہاد کیا، اب آپ دست کش ہو

۱۔ ہندوستان میں جہاد کرنے کو بلوہ خیال کرتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ انگریزوں سے لڑنا نہیں تھا۔

رہے ہیں، اس کا سبب کیا ہے، اب شاہ اسماعیل نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ ہے، ”قصور آپ کا ہے، آپ اظہار حق میں مدہنت کرتے ہیں، ورنہ خرابی نہ ہوتی“ یہ سنتے ہی حاوی خان مجلس سے اٹھ کر چلا گیا، رات کو سید صاحب نے اسے بلا کر منانے کی کوشش کی، مگر اس نے بتایا کہ ان علماء کی گزر بسر اسقاط و خیرات پر ہے، وہ ہمارے تابع ہیں، انہیں کاروبار ریاست کا شعور نہیں ہے، لہذا ان کے مشورے قابل عمل نہیں ہو سکتے، اور آخر میں یہ بھی عرض کیا کہ آپ کا اصول میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ سن کر سید صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گفتگو ختم ہو گئی۔ حاوی خان چاہتا تھا کہ مقرب خان کو اشرف خان کا وارث اور زیدہ کا حاکم بنایا جائے اور قصبہ مانیر پر اس کے حلیفوں کا حق تسلیم کیا جائے، لہذا وہ میجر ونٹورا کو پنجتار پر حملہ کرنے کے لئے بلا لایا، یہ خبر سن کر سید صاحب نے پنجتار میں مدافعت کی تیاری کی، چنانچہ مجاہدین نے موت کی بیعت اور رنگ برنگ کے جھڈے دے کر سید صاحب نے اپنا سر ننگا کر کے دعا مانگی، خود ہتھیاروں سے اپنے آپ کو مسلح کیا، ونٹورا آیا مگر خفیف سی جھڑپ کے بعد واپس چلا گیا۔ اس جنگ پنجتار میں دو سکھ مارے گئے اور غازی محفوظ رہے۔

سید صاحب نے مفاہمت کی غرض سے حاوی خان کو بلایا مگر وہ نہیں آیا، شاہ اسماعیل اس کے پاس گئے تو اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں سید صاحب کی ولایت کا قائل نہیں ہوں بلکہ پکا دنیا دار سمجھتا ہوں۔

سید صاحب اہل سمہ کی تلقین کے لئے گئے اور شاہ اسماعیل کو شرز نش کرنے کے لئے تنگی بھیجا، مگر ان کے ساتھیوں میں سے نصف سے زیادہ درانیوں سے مل گئے، اس لئے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ واقعہ ۱۷ جولائی ۱۸۲۹ء مطابق ۱۵ محرم ۱۲۴۵ھ کا ہے، یہاں اقامت شریعت کی بیعت پر اکثر لوگ تیار تھے مگر سرداران پشاور اور حاوی خان نے انہیں باز رکھا، اس لئے ان مخالفین کو زیر کرنے کے لئے ہنڈ پر حملہ کی ٹھہرائی اور تجویز کی کہ رات کو ۲۵ غازی قلعہ کے دروازے کے قریب چھپ جائیں، صبح کو جب دروازہ کھلے تو اندر جا کر حملہ کر دیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، حاوی خان سرا سیمہ ہو

کراپنے آدمیوں کو بلارہا تھا کہ اس کے ایک گولی لگی اور اس کا کام تمام ہو گیا، غازیوں کی فتح ہوئی مگر اس کا مال اور روپیہ نہیں ملا، سید صاحب نے اس اہل و عیال کو معاف کر دیا اور مقرب خان کی سفارش پر امیر خان کو سردار ہند بنا دیا۔ اور یہ فیصلہ شاہ اسماعیل کی مرضی کے خلاف تھا، حاوی خان کے انحراف و قتل کے متعلق علماء سرحد کا بیان اس سے مختلف ہے، ہند سے مرکز ہٹالینے کا اسے ملال اگر تھا تو اتنے عرصہ تک اس کی عقیدت مندی قائم نہیں رہ سکتی تھی اور نہ وہ اقامت شریعت کی بیعت کرتا، اصل یہ ہے کہ سوات کے حضرت اخون عبدالغفور صاحب کا وہ مرید تھا، اخون صاحب نے سوات و بنیر کے دورے کے زمانہ میں سید صاحب کی خاطر و تواضع کی تھی اور ہمنوائی و تائید بھی کی تھی، لیکن جب شاہ اسماعیل نے عدم وجوب تقلید کا اعلان کیا تو علماء سرحد ان سے علیحدہ ہو گئے، لہذا اخون صاحب کی تقلید میں حاوی خان نے بھی سید صاحب سے انحراف کیا اور یار محمد خان سے مل گیا، سید صاحب نے ان پر حملہ کیا تو یار محمد خان جاں بحق ہوا، یہ ستمبر ۱۸۲۹ء کا واقعہ ہے، اس طرف سے جب سید صاحب کو اطمینان ہو گیا تو کشمیر کی فتح کا منصوبہ گانٹھا۔

کشمیر میں اس وقت تر ملا غیر محفوظ تھا، اس پر شاہ اسماعیل نے قبضہ کر لیا مگر دسمبر ۱۸۲۹ء میں ہری سنگھ نے واپس لے لیا، قیام کھبل میں سید اکبر شاہ نے خوب سمجھا دیا تھا کہ کشمیر والوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، مگر سید صاحب نے امب کے سردار پائندہ خان سے تعلقات بڑھائے اور اس سے یہ طے کیا کہ وہ اپنے ملک سے راستہ دے، مگر شاہ اسماعیل جب بھیجے گئے تو کشمیر کے لئے اس نے راستہ نہیں دیا، اس لئے امب پر چڑھائی کرنا پڑی، عشر اور کوئلہ فتح کرنے کے بعد ۱۸۳۰ء میں یہ فیصلہ ٹھیرا کہ پائندہ خان نہ صرف راستہ دے گا بلکہ ہر قسم کی مدد بھی کرے گا اور بعد فتح کشمیر اسے مشرقی انڈس میں علاقہ دینے کے ساتھ کشمیر میں بھی جاگیر دی جائے گی، اس صلح سے پہلے شوال ۱۲۴۵ھ میں پھوسنرے پر سکھوں کے خلاف لشکر بھیجا گیا، اس زمانہ میں پائندہ



خان بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا اور اس نے حسب معاہدہ مدد نہیں کی، لہذا غازیوں کو شکست ہوئی، لیکن سکھ خود بخود میدان چھوڑ کر چلے گئے، اب پائندہ خان سے صلح ہو جانے پر امب کو مرکز بنایا اور شرعی قانون جاری کیا گیا، طے ہوا کہ مشرقی سمت میں پیش قدمی کی جائے۔

سید صاحب کی کامیابیاں دیکھ کر رنجیت سنگھ نے وزیر سنگھ اور حکیم عزیز الدین کی معرفت صلح کا پیغام بھیجا کہ سید صاحب فقیر ہیں اور میں امیر ہوں، امیروں کو فقیروں کی خدمت کرنا لازمی ہے اور فقیروں کا فرض ہے کہ امیروں کے لئے دعا کریں، میں اپنی طرف سے ماورائے سندھ کا علاقہ نذر کرنے کو تیار ہوں، اس سے زیادہ مطالبہ سید صاحب کریں گے تو مثل دنیا داروں کے حریص سمجھے جائیں گے، اس پیغام کا جواب مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور حاجی بہادر خان کی سفارت میں بھیجا گیا، لیکن یہ سفارت رنجیت سنگھ کے بجائے میجر ونٹورا کے یہاں پہنچی، مولوی صاحب اور میجر میں جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

میجر ونٹورا: میں آپ سے کچھ علمی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مولوی خیر الدین: (اس سے پہلی ملاقات میں کچھ تیز گفتگو ہو گئی تھی لہذا جواب دیا گیا) اگر دینی گفتگو منظور ہے تو خلاف امید جوابات پر کبیدہ نہ ہونا۔

میجر: میں یقین دلاتا ہوں کہ کبیدہ نہیں ہوؤں گا، لیکن جواب عالمانہ ہوں، سو قیامت نہ ہوں۔۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ خلیفہ صاحب کو اپنے یہاں ہر طرح کا عیش حاصل تھا۔

مولوی صاحب: ایسی ثروت و جاہ و جلال کو چھوڑ کر ایسی تکالیف سفر اختیار کرنا بلا کسی سبب کے نہیں ہے، اب آپ غور سے سنیں، وہ قوی سبب یہ ہے کہ دین اسلام میں بعد ایمان تو حید کے پانچ احکام فرائض اور ضروری رکن

ہیں، ان کے ادا کرنے کی تاکید ہے، نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور جہاد، جہاد کا ثواب سب سے زیادہ ہے، جہاد انبیاء اسرائیل پر بھی فرض تھا۔

میجر: بجا ارشاد ہے، مجھے معلوم ہے کہ جہاد کی اہمیت قدیم زمانہ سے ہے۔  
 مولوی صاحب: اب خلیفہ صاحب کی ذات مقدس مثلاً انبیاء سابقین مقبول بارگاہ ایزدی ہے۔۔۔ اس جہاد شاقہ کی دو شرطیں ہیں، ایک وجود امام اور دوسری جائے امن، قوم یوسف زئی سکھوں سے لڑتی رہتی ہے، لیکن ان کے پاس قابل سردار رہنمائی کے لئے نہیں ہیں، اسی غرض کے لئے سید صاحب آئے ہیں، اس ملک کے لاکھوں آدمیوں نے خلیفہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت کر لی ہے اور آپ کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جہاد سے مطلب ملک گیری اور جنگ و جدال نہیں ہے بلکہ واسطے اعلاء کلمۃ اللہ و اطفاء ناسیدہ ادیان باطلہ اور کفار کی ذلت کے لئے کوشش کرنا ہے۔۔۔ جہاد سے اصل مطلب ترقی دین ہے اور فتوحات اس کا ثمرہ ہیں، مجاہدین کے فرائض قرآن شریف اور حدیث میں بہت ہیں۔

میجر: مجھے یہ سب باتیں قبول ہیں لیکن ایسی بے سرو سامانی میں بادشاہوں سے لڑنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مولوی صاحب: دنیا داروں کو فوج و خزانہ اور اسباب پر اعتماد ہے اور ہم کو خدا پر بھروسہ ہے، ہمیں نہ جیتنے کی خوشی اور نہ ہارنے کا غم۔

میجر: میرے دل میں خلیفہ صاحب کی بے حد عظمت ہے۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور خلیفہ صاحب کے درمیان ارسال تحائف کی رسم جاری ہو جائے، پہلے میں ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجوں گا، پتہ نہیں اس کے جواب میں وہ کیا تحفہ دیں گے، تاکہ یہاں سے جا کر اپنی اس عزت پر فخر کر سکوں، اس سلسلہ میں ملک یوسف زئی پر ان کا تصرف کرا دوں گا اور

خالصہ کی فوج پھر کبھی خلیفہ صاحب کے خلاف حملہ نہیں کرے گی۔  
 مولوی صاحب: خلیفہ صاحب کو آپ کے اظہار عقیدت و عظمت کی پرواہ  
 نہیں، اگر آپ کی کوئی غرض ہے تو سلسلہ جنابانی کیجئے، خلیفہ صاحب عالی  
 حوصلہ اور صاحب ہمت ہیں، آپ کے تحفوں کے جواب میں اچھا سے اچھا  
 تحفہ دیں گے۔

میجر: اگر سر بند و کلاہ یا اسلحہ سے مجھے نواز تو ایسے تحفہ میرے کام کے نہیں،  
 لیکن گھوڑا مرحمت فرمائیں تو ان کی ناموری اور میری سرخروئی ہو۔  
 مولوی صاحب: آپ کا مطلب اب میں سمجھا، ہم آپ کو گھوڑا کبھی نہیں  
 دیں گے۔

میجر: یہ آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہو مگر میں سمجھتا ہوں خلیفہ صاحب سخی  
 اور عالی حوصلہ ہیں وہ میری درخواست ضرور قبول فرمائیں گے۔

(پرچہ نویس حاجی بہادر شاہ خان اور حکیم عزیز الدین نے مولوی صاحب  
 سے اشارہ کیا کہ میجر کی بات مان لیں۔)

مولوی صاحب: یہ بات وہ مان سکتا ہے جو ملک و جاگیر کا خواہش مند ہو،  
 ایسی نیت و ارادہ سے جہاد کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

بہر حال جب میجر و نتورانے گھوڑے کے لئے اصرار کیا تو مولوی صاحب  
 نے فخریہ فرمایا! گھوڑا تو گھوڑا ہے، ہم آپ کو گدھا بھی نہیں دیں گے، ہمیں تو  
 آپ کی سرکار سے جزیہ لینا ہے۔

میجر: یہ آپ کا محض وہم ہے، اگر آپ نے خالصہ جیسی سرکار کو زیر کر کے جزیہ  
 لے لیا تو میں حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمان ہو جاؤں گا۔

مولوی صاحب: اگر مسلمان ہونا چاہتے ہو اور آپ کی یہی شرط ہے تو آپ  
 خلیفہ صاحب سے مل لیں، ان کو دیکھتے ہی آپ مسلمان ہو جائیں گے۔

میجر: (مولوی صاحب کی فہم و فراست کو سمجھ کر) خیر دیکھا جائے گا، مہربانی کر کے میری درخواست کا جواب خلیفہ صاحب سے بمقام حضور و بھجوادیں۔  
مولوی صاحب: میں خلیفہ صاحب سے عرض کروں گا، جواب دینا ان کی مرضی پر منحصر ہے۔

میجر: معاف فرمائیے گا، آپ کے نزدیک سکھ کافر ہیں اور ہم نصرانی بھی کافر ہیں، تو ہم دونوں کے کفر میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟  
مولوی صاحب: کفر میں دونوں برابر ہیں۔

میجر: ہندوستان پر انگریز نصرانی مسلط ہیں تو خلیفہ صاحب ان سے جہاد کیوں نہیں کرتے؟

مولوی صاحب: انگریزی سرکار ہم کو دینی فرائض ادا کرنے سے منع نہیں کرتی اور سکھ مانع ہیں، اسی لئے ہم ان سے جہاد کرنے آئے ہیں۔ (۱)

یہاں سے جا کر مولوی صاحب نے سید صاحب کو جملہ احوال سے مطلع کیا، انہوں نے ارشاد فرمایا: شاہ ہاش! جزاک اللہ، تمہارے جوابات میری مرضی کے مطابق ہیں، گھوڑے اور گدھے کی بات سن کر محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ آپ نے اچھا کیا کہ ارسال جواب کا وعدہ نہیں کیا۔ (۲)

اس گفتگو کے متعلق ”جماعت مجاہدین“ کے صفحہ ۱۵۶ پر جناب مہر صاحب نے یہ رائے قائم کی کہ مولوی صاحب نے اچھے انداز میں مسائل کی توضیح فرمائی اور تاریخی حوالوں سے اپنے موقف کو ثابت کیا، پھر ”سید احمد شہید“ کے اکیسویں باب

۱۔ مگر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے: اگر بعض احکام اسلام کی مثل جمعہ عیدیں، اذان اور ذبیحہ بقر کے تذکرہ نہ کرتے ہوں لیکن اصل اصول ان کے نزدیک (یعنی انگریزوں کے) غلط و بیکار ہے۔ (فتاویٰ عزیز یہ جلد اول صفحہ ۱۷۱) اس فقرے میں انگریزوں کے ہی نہیں بلکہ سکھوں کے وحشیانہ و ظالمانہ طریقے پر بھی توجہ فرمائی ہے۔

۲۔ منقول از سوانح احمدی اور مہر صاحب کی سید احمد شہید، باب اکیسواں

کے آخر میں رقم طراز ہیں: یہ گفتگو ۱۸۳۰ء میں ہوئی تھی، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ورتوراجب پہلی مرتبہ مولوی خیر الدین سے مل چکا تھا تو اس ملاقات کا حوالہ کیوں نہیں دیا، اس کے متعلق یہی خیال ہے کہ یہ فرد گذشتہ راوی سے ہوئی، جس نے صرف خاص مطلب بیان ضروری سمجھا، مگر مہر صاحب یہ نہ بتا سکیں گے کہ مولوی صاحب نے تاریخی حوالے کون سے دیئے تھے اور انہوں نے توجہ نہیں فرمائی کہ ورتورانے پہلی ہی ملاقات کے متعلق کہا تھا کہ جو بات عالمانہ ہوں اور سوقیانہ نہ ہوں، اب راوی کو ملزم بنانا مہر صاحب کی زیادتی ہے یا ان کی خوش مذاقی ہے، مولوی صاحب کی گفتگو اور سید صاحب کی پسندیدگی پر کسی کوچوں و چرا کرنے کا حق نہیں ورنہ کافر گردی کی مثل صادق آئے گی، بہر حال اس گفتگو اور تصدیق سے اور کچھ نہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سید صاحب کا انگریزوں سے جہاد کرنے کا خیال کبھی ہرگز نہیں تھا، لہذا سید صاحب کے وہ خطوط جن میں انگریزوں سے جہاد کرنے کا ذکر ہے جو شاہ بخارا اور راجہ صاحب سندھیا کو لکھے ہیں وہ بر بنائے مصلحت ہی ہو سکتے ہیں، مولوی خیر الدین نے رنجیت سنگھ کی پیش کردہ شرائط کو مسترد کر دیا لیکن اپنے شرائط کیوں نہیں بتائے اور محض جہاد کی تعریف کر کے رہ گئے، ارشاد قرآنی ہے کہ جہاد کے دوران میں اگر کفار صلح کرنا چاہیں تو کر لینی چاہیے۔ اس کے علاوہ تقاضائے سیاست بھی یہی تھا کہ صلح کر لی جاتی، پھر سید صاحب اور سکھ دونوں مل کر انگریزوں کی خبر لیتے، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں پادری صاحبان لوگوں کو زبردستی عیسائی بنا رہے تھے اور انگریز مسلمانوں کا ہی نہیں کل ہندوستان کا خون چوس رہا تھا۔

یار محمد اور حاوی خان کے مارے جانے کے بعد سید صاحب کے یہاں عید منائی جا رہی تھی جس کی وجہ سے سلطان محمد خان پر بری بنی تھی، آخر کار اپنی ماں کی ہدایت سے مجبور ہو کر اسے ہنڈ پر حملہ کرنا پڑا، اس زمانہ میں سید صاحب کھبل میں قیام پذیر تھے اور کشمیر فتح کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے، ہنڈ فتح کر کے سلطان محمد خان نے امیر خان کے سپرد کر دیا اور خلاف معاہدہ غازیوں کو قید کر کے چار سدا بھیج دیا، مگر

غازی دیوار میں نقب لگا کر سیدھے سید صاحب کی خدمت میں پنجتار پہنچ گئے، جب پنجتار سے امب تک کے علاقہ پر سید صاحب کا تسلط ہو گیا تو سلطان محمد خان اور پائندہ خان نے سکھوں سے ساز کر کے سید صاحب کی مخالفت کی، لہذا سید صاحب مورچوں کی مرمت کروانے لگے اور شاہ اسماعیل کو بار بار لکھا کہ مستورات کو یہاں سے لے جا کر ستھنہ پہنچادیں، انہوں نے جواب دیا کہ اگر مستورات اور خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو امب سے ستھنہ پہنچانے سے شوکت اسلام کو ضرر پہنچا تو خدا کے یہاں آپ جواب دہ ہوں گے، یہ بھی یقین رکھیے کہ جب تک سو غازیوں کے سر نہیں کٹ جائیں گے، خدا نخواستہ آپ کے حرم تک نوبت نہیں آئے گی، سید صاحب نے اس تحریر پر فرمایا کہ میرے بھانجے سید احمد علی کی طرح سچی بات کہنے میں میاں صاحب بھی مراعات ادب کی پرواہ نہیں کرتے، مگر مہر صاحب سید صاحب کے اس شبہ کی تکذیب کرتے ہیں کہ اس تحریر میں مراعات ادب کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ (۱)

عشر وصول کرنے کے لئے عمال مقرر کر دیئے گئے، سب نے اسے قبول کیا مگر ہوتی مردان کے احمد خان نے عمال کی تقرری پر اعتراض و اختلاف کیا، لہذا سید صاحب کے عتاب سے بچنے کے لئے اس نے گڑھی جھوڑ کر پشاور میں پناہ لی۔

سلطان محمد خان ہنڈ فتح کرنے کے بعد پنجتار پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن پائندہ خان اس سے علیحدہ ہو کر ہزارہ چلا گیا، لہذا ارادہ ترک کرنا پڑا، مگر بعد کو احمد خان کی تقویت پر جب حملہ کیا تو مہیار پر شکست ہوئی۔

ہوتی پر تسلط جمانے کے بعد مفاہمت کے لئے سید صاحب نے سلطان محمد خان کو خط لکھا، اس نے جواب میں لکھا کہ تم مصنوعی فقیر ہو، ہم نے تمہارے قتل کی ٹھان لی ہے اور تمہارے ناپاک وجود سے ہم اپنے ملک کو بچانا چاہتے ہیں، اس جواب کے بعد لڑائی ناگزیر تھی، مہیار پر سلطان محمد خان کے خلاف مردان والوں سے تصفیہ کر لیا اور شرط یہ ٹھہری کہ سید صاحب کا لشکر گڑھی کے باہر شہرے اور امیر المؤمنین گڑھی

۱۔ سید احمد شہید، ص ۲۳۱



میں قیام فرمائیں، مگر جب تو رو سے سید صاحب یہاں آئے تو مع لشکر کے گڑھی میں داخل ہو گئے، مردان والوں نے اس کی شکایت شاہ اسماعیل سے کی تو شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے پاس جا کر فرمایا کہ جناب خود خلاف شرع امور کے مرتکب ہوتے ہیں۔۔۔ لشکر کو باہر میدان میں شہرنا چاہئے تھا، آپ پیرزادوں کے قافلہ کی طرح گڑھی میں کیسے گھس آئے، حاضرین کو شاہ صاحب کا یہ طرز کلام پسند نہیں آیا تو شاہ اسماعیل نے اپنی سخت کلامی کی معافی مانگی، اس پر سید صاحب نے اقرار کیا کہ مجھے معاہدہ کی خبر نہ تھی ورنہ مع لشکر کے اندر نہ آتا۔ (۱)

تورو کے قیام میں سید صاحب کو جو گوشت کھانے میں پویا گیا وہ کچھ جل گیا تھا، سید صاحب نے نہیں کھایا، دال پر گزر کی اور گوشت پکانے والے کو خطابات از قسم مردود وغیرہ مرحمت فرمائے، میاں نظام الدین کے ٹوکنے پر اقبال کیا کہ بے اختیاری میں منہ سے یہ الفاظ نکل گئے اور گوشت پکانے والے میاں عبداللہ سے معافی مانگی (۲) سلطان محمد خان کی منافقت کی وجہ سے سید صاحب پشاور پر حملہ کیا، راہ میں ہر جگہ استقبال ہوا اور پشاور فتح کر لیا، سلطان محمد خان کے وکیل ارباب فیض اللہ خان سے سید صاحب سے سلطان محمد خان کو معافی دلوائی تو امارت شرعیہ کا انتظام اسی کے سپرد کر دیا۔ سلطان محمد خان کی بحالی کے ہر شخص خلاف تھا اور خود بھی سید صاحب صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ (۳)

بہر حال یہ سب انتظام کر کے سید صاحب پنجتار کو تشریف لے گئے، اثناء راہ میں گڑھی امان زئی (عثمان زئی) کے بالا خانہ پر قیام فرمایا، ایک لڑکا تحفہ میں کچھ پھل لایا تھا اور لکڑی کی سیڑھی پر کھڑے کھڑے زیادہ انعام کی درخواست کر رہا تھا، جس کی وجہ سے راستہ مسدود ہو گیا تھا، شاہ اسماعیل نے ہٹانے کی کوشش میں اس کے چند طمانچے رسید کئے، اتفاق سے ایک مرتبہ وار خالی گیا اور سیڑھی کی ایک کیل ان کے ہاتھ میں چبھ گئی جس کی وجہ سے خون نکلنے لگا۔ سید صاحب نے سبب دریافت کیا تو منشی

۱۔ سید احمد شہید، ص ۲۶۴، ۲۔ سید احمد شہید ۳۔ سید احمد شہید صفحہ

محمد انصاری نے شاہ اسماعیل کے اس جہاد کی پوری روئید اسنادی تو سید صاحب نے فرمایا کہ ان دنوں میاں صاحب کا غصہ تیزی پر ہے، اسے دور کرنا چاہیے، اس پر منشی محمد انصاری نے کہا کہ مولانا عبدالحی کو جب غصہ آتا تھا تو وہ جاوہ شرع سے نہیں ہٹتے تھے، لیکن شاہ اسماعیل نے اس کی توجیہ فرمائی۔۔۔ ان کا غصہ آوڑ تھا۔۔۔ اور میرا غصہ آمد ہے، جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر غلبہ کر لیتا ہے۔ زبان کیا کسی عضو پر قابو نہیں رہتا۔

یہ آخری فقرہ وضاحت کی جان ہے، مہر صاحب نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ شاہ صاحب حقانی و ربانی آدمی تھے، اس لئے اپنے عیوب کا اقرار کر لیتے تھے۔ (۱) یہ تشریح فصاحت کے ساتھ ظرافت بھی رکھتی ہے، قربان شوم، بروز محشر پیش داوڑ مولانا مہر کی تشریح و تاویل کام نہ آسکے گی پنبہ کجا کجا نہم۔

فتح پشاور کے بعد راوی چین لکھتا ہے، لہذا اسکھوں کی مزاج پرسی کرنے کا یہ بہترین موقع تھا، مگر قضاء و قدر اور شامت اعمال کو کیا کہا جائے، عمال اور قاضیوں کی نفسانیت بروئے کار آئی، عشر کی وصولی کے لئے بے حد زیادتیاں کی گئیں، شادی شدہ کنوایوں اور بیواؤں کے زبردستی نکاح پڑھوادیئے گئے، اس سے پہلے یہاں کی عورتیں سمجھتی تھیں کہ سید بادشاہ کے غازی اولیاء ہیں، اب وہ سمجھیں کہ اولیاء بے قید ہیں، مرد زن ان سے پناہ مانگنے لگے، اپنی عزت و ناموس کو برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر ان اولیاء بے قید کے خلاف سازش گانٹھی جانے لگی، سید صاحب کو متعدد مرتبہ اس سازش سے آگاہ کیا گیا مگر سمجھا دیا گیا کہ مجاہدین کفار و شیاطین سے مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں، ان کے قدم جاوہ اعتدال سے نہیں ہٹ سکتے اور شیطان انہیں نہیں بہکا سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز فجر پڑھتے میں مجاہدین کو فردوس بریں کا رستہ دکھا دیا گیا، اناللہ وانا الیہ رجعون۔ (۲) جب پشاور میں یہ واقعہ ہو گیا تو طوطے ہرن ہو گئے اور زبان فیض ترجمان گویا ہوئی کہ ”ہم ابتداء میں یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے

۱۔ سید احمد شہید، صفحہ ۲۸۵ ۲۔ ”سید احمد شہید“ از غلام رسول مہر

عادات و حالات سے واقف نہیں تھے، وعظ و نصیحت کا اثر نہ ہوا تو حاکمانہ فہمائش سے کام لیا، مگر یہ بھی غلط شہری، اجراء دین کے علاوہ ہمارا کچھ اور مدعا نہ تھا۔۔۔ اب ہم وہاں جا کر مقیم ہوں گے جہاں صادق القول ہوں گے۔“ (۱)

نہایت سچائی سے سید صاحب نے حقیقت واقعی کا اقرار کر لیا، مگر ان کی سادگی و معصومیت نے ان کے ابتدائی دعوؤں اور پیش گوئیوں کو فراموش کر کے الزام یہاں والوں کے سر تھوپ دیا، ناکامی و پشیمانی کا ثبوت یہ ہے کہ سب کو بیعت کے بندھن سے آزاد کر دیا اور اعلان فرمایا کہ مجھے ان لوگوں سے ایسی نفرت ہے جیسے کسی کو قئے سے ہو، لہذا یہاں سے ہجرت کرنا ضروری ہے، فتح خاں سے کہا کہ یہ لوگ کلمہ توحید عادت پڑھتے ہیں، لہذا ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کی دوا کریں تاکہ کلمہ گوئیوں کی طرف سے شک زائل ہو جائے، یہ فقرے جذباتی تھے اور ان کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، وقت و داع آخری خطبہ میں نصیحت کی کہ ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے، ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے کہ سید نے دھوکہ دیا، پھر وصیت فرمائی کہ ہم سے جدا رہ جانے والے بھائیوں کو خراسان یا ہندوستان یا دوسرے ممالک میں نہیں بسنا چاہیے، بلکہ عرب کے سوا اور کہیں توطن اختیار نہ کریں، اگرچہ عرب بھی بدعات سے خالی نہیں ہے، سب سے آخر میں شاہ اسماعیل سے سرگوشی کی کہ آپ قرآن پاک کی تلاوت فرمائیں اور میں مراقبوں میں مشغول رہوں گا، یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے جہاد کا انتظام ہو سکے، دیوانہ بہ کار خویش اسی کو کہتے ہیں، چومیر دہتلا میرد چو خیز دہتلا خیزد۔

یہاں سے رخصت ہو کر دامن کوہ میں پہنچے، جنوری ۱۸۳۱ء کی ابتداء میں راج دواری میں قیام فرمایا اور ہمراہیوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہش نفسانی وغیرہ میں مسلمان بھائیوں کو مقدم رکھیں اور مقام تکلیف میں اپنے آپ کو مقدم سمجھیں، سب نے بیعت کی مگر شاہ اسماعیل نے بیعت سے انکار کر دیا کہ وہ اس شرط کو نباہ نہ سکیں گے،

۱۔ ”سید احمد شہید“ از غلام رسول مہر

دراصل یہی جواں مردی کی بات ہے کہ صاف انکار کر دیا۔

۵/۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ پہنچے، اب ان کی طبیعت میں تغیر واقع ہوا، تفویض و توکل کا رنگ نمایاں ہوا اور تدبیروں سے دل چسپی نہیں رہی، اتنے میں شیر سنگھ نے بالاکوٹ کا محاصرہ کر لیا اور سید صاحب کے کسی فرشتہ صفت مجاہد نے گڑھی میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ اسے بتا دیا۔ ۶/۱۸۳۱ء مطابق ۲۳/۱۲۳۶ھ کو سید صاحب مسجد زبیر میں اطمینان و محویت کے ساتھ مصروف عبادت تھے، لیکن شیر سنگھ نے جب حملہ کیا تو یکدم تکبیر پڑھتے ہوئے چل پڑے اور دل میں چھلانگیں مارتے ہوئے جارہے تھے کہ ایک پہاڑی پر نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے نہ بصارت کو نظر پڑے نہ بصیرت کو دکھائی دیئے، اب جس کا جیسا جی چاہے ویسا ہی قیاس کر لے، کسی نے کہا کہ توپ کا گولہ اڑا لے گیا، کوئی سمجھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر چڑھائے گئے، بعض نے قیاس کیا کہ کسی بگڑے دل غازی نے تلوار کے گھاٹ اتار کر دل میں دبا دیا اور خوش تمیدہ اصحاب نے وثوق سے کہا کہ پھر نمودار ہونے کے لئے پردہ فرمایا ہے، پروفیسر فری لینڈ ایبٹ کی تحقیق ہے کہ لاش پہچان لی گئی تھی اور نذر آتش کر دی گئی تھی، یہ بھی شہرت ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب اور شاہ اسماعیل کی لاشوں کو دوسرے دن اچھی طرح شناخت کروانے کے بعد عزت کے ساتھ دفن کروا دیا تھا، اب شاہ اسماعیل کی قبر بالاکوٹ میں موجود ہے اور سید صاحب کی قبر مشتبہ ہے۔ (۱) شاہ اسماعیل کی قبر پر لوگ نسوار چڑھا کر مرادیں مانتے ہیں حالانکہ شاہ صاحب قبر پرستی کے سخت مخالف تھے۔ (۲)

نتیجہ قدرت کے اختیار میں ہے مگر مرد آخر میں مبارک بندۂ ایست، لہذا یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس ناکامی یا کامیابی کے اسباب کیا ہوئے، سید صاحب کے سوانح نگاروں کے بیان لکھ دیئے گئے، اب دوسروں کی رائے بھی دیکھنا چاہیے، مولانا

۱۔ حیات طیبہ ۲۔ موج کوڑ صفحہ ۲۱ کانٹ

ابوالکلام آزاد صاحب نے اپنے والد سے سن کر جو حالات لکھے ہیں، ان میں اہمیت ہے۔ (۱) مولانا کے والد کی روایت ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی جائیداد اپنے عزیزوں میں تقسیم کر دی۔۔۔ اور مولوی اسماعیل کے لئے کچھ بھی نہ رہا تو دنیا کی طلب ان کے دل میں سنائی اور یہ ڈھنگ نکالا کہ پیری مریدی کا نیا کارخانہ جمایا جائے، سید احمد بریلوی ٹونک کی فوج میں ایک ان پڑھ سپاہی تھے، سازش کر کے انہیں پیر بنایا، مولوی عبدالحی جو شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے داماد تھے وہ بھی بیٹی کے محروم رہ جانے سے برداشتہ خاطر تھے، شریک سازش ہو گئے اور صورت یہ قرار دی کہ خدا کی دین میں کسی کا کیا لینا دینا ہے، ہم نواسے اور داماد تھے مگر محروم رہ گئے اور شاہ صاحب کا تمام باطنی فیض ٹونک کے اس سپاہی کو مل گیا، آدمی یعنی مولانا اسماعیل شہید ذہین و لسان تھے، بہت جلد لوگوں میں غلغلہ مچا دیا، لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک معمولی ان پڑھ آدمی کو شاہ صاحب کے نواسے (۲) نے پیر مان لیا ہے، اس کی پالکی پکڑ کر جوتی بغل میں داب کر دوڑتا ہے اور اعلانیہ اپنی محرومی اور ان کے فیضان کا اقرار کرتا ہے تو اس سے لوگوں میں بڑا ہی رنگ جما اور ہر طرف سے چاندی سونے کی بارش ہونے لگی، اس زمانہ میں ”صراط مستقیم“ لکھی اور اس میں سید احمد کو ولایت سمبھی بڑھا کر نبوت تک پہنچا دیا اور ساری باتوں میں آنحضرت ﷺ سے تشبیہ دی، گویا پورا آنحضرت ﷺ کی ریس اور مقابلہ کر دکھایا، مہر میں ”اسمہ احمد“ نقش کر یا، لوگوں سے کہتے کہ جو شخص مرید ہوتا ہے اسے فوراً کشف و مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے، لوگ اس شوق میں آتے اور مرید ہو جاتے، چالاکی یہ تھی کہ ڈیوڑھی پر مولوی اسماعیل موجود رہتے، وہ نو واردوں کے کان میں کہہ دیتے کہ جو شخص صدق دل سے مرید ہوتا ہے، ان کی پہلی ہی توجہ میں فائزہ المرام ہو جاتا ہے، ہاں جو شخص خدا نخواستہ ولد الزنا ہو اسے خبث ولادت کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آتا، اب وہ غریب جاتا ہے اور مرید ہونے کے بعد نکلتا ہے تو نظر تو اسے خاک نہیں آیا تھا، لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر کہتا ہوں

۱۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی، صفحہ ۳۵۴ ۲۔ نواسے کے بجائے بھتیجا ہونا چاہیے۔

کہ کچھ نظر نہیں آیا تو سب ولد الزنا کہیں گے، اس ڈر سے وہ کچھ نہ کہتا اور جب لوگ مبارک، مبارک کی صدا میں بلند کرتے تو سر جھکا کر خاموش رہ جاتا، اس طرح جب خوب رنگ جم چکا تو اب موقع آیا کہ جو اصل شیطنیت اس کارخانہ سے مقصود تھی اسے عمل میں لایا جائے، وہ کیا تھی، یہ بھی ایک مشکل کہانی ہے، یہ گویا ہندوستان میں وہابیت کی تولید و شیوع کی تاریخ قرار دی گئی تھی اور زیادہ تر مقصود اس سے یہ تھا کہ ہندوستان کی وہابیت کا شجرہ نسب بہ آسانی نجد کی وہابیت سے ملا دیا جائے۔

جب دیکھا کہ دین جدید کی مخالفت کی وجہ سے پیری مریدی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا ہے اور علماء اہل سنت کی مقاومت روز بروز بڑھتی جاتی ہے تو جلب زر کی نئی راہ پیدا کر لی اور لوگوں کی توجہ فتنے کی طرف سے ہٹانے کے لئے جہاد کا غلغلہ بلند کیا اور سید احمد کی امامت کا اعلان کیا، اس پر خوب ہمن برسے لگا، جوق در جوق احمق دام میں پھنسنے لگے، ہزاروں روپیہ کی ہنڈیاں آنے لگیں، اور مجاہدین کا غول لے کر سکھوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے، سکھوں سے کیا لڑنا تھا خود مسلمانوں کو مشرک و بدعتی بنا کر دین جدید کا فتنہ پھیلاتا تھا، سرحد پہنچ کر خود مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیا، آخر کار جب غیرت مند سرحدی جوش میں آئے اور سلطان محمد خان غیرت دینی سے آمادہ مقابلہ ہوا تو جان بچا کر بھاگنا چاہا مگر اس نے مہلت نہ دی اور سب کا قلع قمع کر دیا، مریدوں نے سوچا کہ پیروں کا قتل خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا ہے اور جہاد و شہادت کی جگہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہلاکت ہوتی ہے، اب کس طرح بات بنانی چاہیے، تب یہ سازش کی کہ سکھوں سے لڑائی کا بہانہ گھڑا، اور مسلمانوں کو لوٹنے کے لئے مشہور کر دیا کہ سکھوں سے لڑتے ہوئے میدان جہاد میں سید احمد اور مولوی اسماعیل شہید ہوئے، لیکن وہ اب پھر زندہ کئے جائیں گے اور بھیجے جائیں گے تاکہ سکھوں سے پنجاب کو نجات دلائیں، چنانچہ کچھ دنوں بعد سرحد کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھال میں بھوسہ بھر کر ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا اور سید احمد کے کپڑے پہنا کر مشہور کیا



کہ وہ زندہ و سلامت مشغول مراقبہ ہیں اور اس طرح اپنی دکان جمالی۔“ اپنے والد کا یہ بیان لکھنے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اپنے عقیدے کے مطابق لکھا ہے کہ بلاشبہ ان کی شہادت کے بعد سرحد کی مقیم جماعت میں بعض غلاۃ اس قسم کے وہم میں پڑ گئے تھے۔۔۔۔۔ کہ بعض عزم و جوش کے کلمات کو بطور پیش گوئی کے قرار دیں اور اس کی تکمیل کے لئے ان کی رجعت کا عقیدہ تراشیں۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاہد مولوی ولایت علی صادق پوری ان دو وہموں میں مبتلا ہو گئے تھے، ایک رجعت، دوسرے روایات ظہور مہدی کا ان پر انطباق، لیکن یہ ایک محدود جماعت کا خیال تھا۔۔۔۔۔ یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی اغراض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا، لیکن اس کا روائی کی حقیقت بہت جلد کھل گئی، ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا فضل رسول بدایونی صاحب کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں کی ملازمت میں تھے، انہیں سید صاحب کی مخالفت کرنے کے لئے وظیفہ ملتا تھا، مگر اسی قسم کا الزام مولوی عبدالحی پر عائد ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی میرٹھ میں انگریزی ملازم تھے اور انگریزوں نے ان کے ذریعے اپنی بلا یہاں سے پنجاب میں بھجوائی تھی، مولانا فضل رسول نے مولانا خیر الدین کے بیان کی ہی تائید کی ہے اور اس کے علاوہ جو باتیں لکھی ہیں وہ ان کی چشم دید ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ شاہ اسماعیل کے نئے عقائد کی وجہ سے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے والے ان سے دست بہ گریبان ہو گئے، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ اور صاحبزادگان شاہ رفیع الدین نے شاہ اسماعیل کے خلاف فتوے لکھے، حضرت مولوی فضل حق خیر آبادی نے شاہ اسماعیل کا ابطال کیا، شاہ اسماعیل صبح کے وقت منگل کے دن ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۳۵ھ کو جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، ایک استفسار مرتب کیا گیا، جس پر مولوی فضل حق، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ، مولوی محمد شریف، مولوی عبداللہ اور اخون شیر محمد صاحبان

کے دستخط تھے، مولوی عبدالحی اسے دیکھ کر قائل ہو گئے اور شاہ اسماعیل غصہ سے مغلوب ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، ہزاروں آدمی اب اس عقیدے سے تائب ہوئے، اب جہاد کا نغمہ شروع کیا اور ایک جماعت کے ساتھ بغرض جہاد افغانستان کو گئے، سید احمد کو امیر المؤمنین بنایا اور پیش گوئیاں مشہور کیں کہ فلاں تاریخ رنجیت سنگھ مارا جائے گا، فلاں دن فلاں ملک فتح ہوگا اور فلاں سال عید کی نماز لاہور کی جامع مسجد میں امیر المؤمنین پڑھیں گے، اللہ کا یہی حکم ہوا ہے اور لڑائی میں امیر المؤمنین سکھوں کی توپوں اور بندوقوں کا منہ بند کر دیتے ہیں، کچھ افغان داخل بیعت ہوئے لیکن مقابلہ کے وقت جان بچا کر علیحدہ ہو گئے، پنجتار کارنیس فتح خاں اور سب افغان تعظیم سے پیش آئے، سب نے جہاد کی بیعت کی، خراج بھی دیا، عامل و حاکم مکانوں پر مقرر کر دیئے گئے اور امیر المؤمنین کا حکم جاری ہو گیا، جو شرکت جہاد سے معذور تھے انہوں نے عورتوں کے زیور سے مدد کی۔۔۔۔۔۔ مولوی اسماعیل خوشی میں بے آپ ہو گئے، دین جدید کی تبلیغ کی گئی، سید صاحب کے نام میں ”صلی اللہ علیہ وسلم“ جوڑا گیا، سکھ میں اسمہ احمد لکھوایا، ان کے بزرگ شروع سے شاہ اسماعیل کی بے قیدی اور جدت پر ان سے ناراض تھے، شاہ عبدالعزیز نے اپنا مملوکہ نواسوں کو دے دیا تو مولوی اسماعیل کھل کھیلے، عقائد کے علاوہ دوسرا فساد سید صاحب کو متنبی بنانے کا ہے، عبدالحی میرٹھ میں انگریزوں کے محررتھے، انہوں نے شاہ اسماعیل کو لے کر سید احمد کو پیر بنایا، ساتھ لے کر شہروں میں گشت کیا، نذرانوں کی قبولیت میں حرام و حلال کی تمیز نہیں کی، بنارس میں آگسٹس بروک کی داشتہ کو مرید کیا، اس کی نذر قبول کر کے سید صاحب نے اسے اپنی بیٹی بنایا، راقم (یعنی مولوی فضل حق) وہاں موجود تھا، عبدالحی سے جب رقم نذرانہ کے متعلق میں نے استفسار کیا تو جواب نہ بن پڑا، یہ عبارت سیف الجبار سے ماخذ ہے، صحیح واقعات اس میں لکھے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کا عہد ہر نوعیت سے مثالی ہے، اس میں خزاں و بہار پوری

آب و تاب سے جلوہ نما ہیں، ایک طرف انحطاط و ابتدال نمایاں ہے اور دوسری طرف اردو زبان کمال کو پہنچ رہی ہے، اسی زمانہ میں شاہ اسماعیل نے مذہبی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور سید احمد کی سربراہی میں سکھوں سے جہاد کی بنا ڈالی تھی، ظفر کے زمانہ کے شاعر محض شاعر نہیں تھے بلکہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ بھی رکھتے تھے، جب شاہ اسماعیل نے اپنی نجدیت نوازی سے ”امکان نظیر“ کی لاطائل بحث چھیڑی اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاتم النبیین ہونے کی اہانت کی تو مولوی فضل حق خیر آبادی نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں اور مرزا غالب نے فیصلہ کن مثنوی لکھی، کہتے ہیں کہ:

ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمۃ للعالمین ہم بود  
 کثرت ابدائے عالم خوب تر یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر  
 منشائے ایجاد عالم یکے است  
 گر دو صد عالم بود خاتم یکے است  
 در یکے عالم دو خاتم را مجو  
 صد ہزاراں عالم و خاتم مگو

مومن خان حضرت سید احمد صاحب کے معتقد اور شاہ اسماعیل کے ہم نوا تھے، انہوں نے تحریک جہاد میں بہت خوب مثنوی لکھی ہے، محمد شاہ بادشاہ کے استاد شاہ نصیر اس تحریک جہاد کے خلاف تھے، جب جہاد کی ناکامی کی خبر دہلی میں آئی تو انہوں نے پر لطف قصیدہ لکھا:

کلام اللہ کی صورت ہوا ان کا دل سی پارہ  
 نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی  
 ہرن کی طرح میدان و غام میں چوکڑی بھولے  
 اگرچہ تھے دم شملہ سے وہ شیر نیستانی

اس قسیدے سے ناراض ہو کر اسماعیلیوں نے ان پر حملہ کیا تو دہلی کے کووال میرزا خانی نے انہیں بچایا، چنانچہ یہ شعر اضافہ کر کے کووال صاحب کی مہربانی کا اعتراف کیا ہے:

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا

نہ ہوتے شمنہ دہلی اگر یاں میرزا خانی

اس جہاد کا زمین سے آسمان تک ڈنکہ بج رہا ہے لیکن سکھوں کی پیشانی پر برائے نام بھی بل نہیں آیا، ان کی تاریخ اس جہاد کو پرکاہ کے برابر نہیں سمجھتی، وہ کہتے ہیں کہ جنگ اکوڑہ میں بدھ سنگھ کو شاندار کامیابی ہوئی، مجاہدین کو بری طرح پسپا ہونا پڑا، اس زمانہ میں رنجیت سنگھ، بدھ سنگھ سے ناراض تھا، اس لئے کہ بدھ سنگھ نے فریب دے کر قلعہ گوہنڈ نگر پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اکوڑہ پر بدھ سنگھ کی کامیابی پر اس کا جرم معاف کر دیا، سکھ اقرار کرتے ہیں کہ اکوڑہ میں غازیوں کو شکست دینے کے بعد ہم جہانگیرہ پہنچے تو غازیوں نے ہمیں محصور کر دیا، لیکن رسد ختم ہو جانے پر ہمیں مورچوں سے باہر آنا پڑا، پھر بھی بڑی خون ریزی کے بعد غازیوں کے ہم نے منہ پھیر دیئے، وہ فار بندی سے باہر چلے گئے، لیکن ہم نے ان کا تعاقب نہیں کیا، یہاں سے فرار ہو کر غازیوں نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور عرصہ دراز تک سر نہ اٹھا سکے۔

برخلاف اس کے حق پرست مجاہدین کا بیان ہے کہ ہمارے شب خون سے بدھ سنگھ کا لشکر منتشر ہو گیا، بعد کو مجتمع ہو کر اس نے عقب سے حملہ کیا، لیکن ہم فار بندی سے بخیر و خوبی باہر نکل آئے اور سکھوں کو تعاقب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، ایماندار تذکرہ نگاروں نے غازیوں کے شب خون کا قصیدہ لکھا ہے کہ یہ شب خون جنگ بدر کے یوم الفرقان کی طرح لیلۃ الفرقان تھا۔ (۱) مزید بیان ہے کہ بدھ سنگھ لاہور کی طرف بھاگا جا رہا تھا تو اٹک کے قلعہ دار نے اسے سمجھایا کہ خلیفہ صاحب خیر آباد اور اٹک فتح کر لیتے کے بعد اس ملک پر تسلط جمائیں گے، یہ سمجھ کر بدھ سنگھ واپس ہوا۔ (۲)

۱۔ سہرت علیہ احمد شہید از مولانا ابوالحسن علی ندوی، صفحہ ۱۴۷، ۲۔ سوانح احمدی: ۱۰۰

معتقدین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکوتی صفات درجہ بشریت میں اتر آئے تھے، ان کا جہاد از قسم فساد تھا، ان کے خیال کو نیک سمجھا جاسکتا ہے لیکن فروعی مسائل میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے مقصد کو کھو دیا۔ اکثریت ان سے علیحدہ ہو گئی، انہوں نے اوہام کو الہام ظاہر کیا اور ان کی خواب پرستی سے کام نہ بنا، ظاہر ہے کہ مقام جہاد انہوں نے غلط تجویز کیا، سرحد میں مختلف قسم کی بیعتیں اور ہر مرتبہ مرکز کی تبدیلیاں وبال جان بن گئیں، یہ وہاں کے فریب سے واقف نہ تھے اور کبھی ہرگز نہ سوچا کہ اپنی اس کارگزاری سے انگریزوں کو قوت پہنچا رہے ہیں، ان کے کمالات سے نہ یہاں کے مسلمانوں کو فائدہ ہوا اور نہ وہاں کے مسلمانوں کے کچھ ہاتھ آیا، رنجیت سنگھ نے صلح کا پیغام بھیجا مگر مسترد کر دیا، اگر صلح کر لیتے تو دونوں مل کر انگریزوں کو آسانی سے نکال سکتے تھے، مرشد بن کر انہیں حکم چلانا آیا مگر خدمت کرنے کا خیال نہیں بندھا، یہاں کے نفاق کو وہ دور نہ کر سکے، دشمنوں کو دوست بنانے کے بجائے دوستوں کو دشمن بنا لیا، شاہ اسماعیل نے جس طرح ہندوستان میں تفرقہ کی بنیاد رکھی تھی، اسی طرح یہاں افغانستان میں بھی فساد کی فضا پیدا کر دی، وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو انہیں سورہ توبہ پڑھ کر سنا دیتا یا غزوہ تبوک کے حالات بتا کر ان کے دماغ میں روشنی پہنچاتا اور ان کی سمجھ میں آجاتا کہ منافقوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، وہاں کے ملاؤں کے حقوق غصب کر لئے، عشر کی آمدنی سے غریبوں کی مدد نہیں کی، شرع کے نام سے ایسی سختی کی کہ شرع شرما کر رہ گئی، کسی کی عزت و ناموس کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اب کیسے سمجھا جائے کہ انہوں نے اسلام کے دور اول کا اتباع کیا، سید صاحب نے اعلان تو برابر کیا کہ ہمارا مدعا حکومت نہیں ہے، ہم دین کی خاطر جہاد کرنے آئے ہیں مگر چند روز کی حکومت الہیہ وہ کمالات دکھائے کہ درود یوار خون کے پیاسے ہو گئے، ان کی جنگیں سکھوں سے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی وہاں کے مسلمانوں سے لڑنے کی اہمیت ہے، سکھوں کا وہ کچھ نہ بگاڑ سکے مگر مسلمانوں کے لئے ملک الموت ثابت ہوئے۔ جہاد سے بجائے فائدہ اٹھانے کے مسلمانوں کی مٹی خراب کر دی، سکھوں کو پریشان کیا اور انگریزوں کو تقویت پہنچائی، امیر المؤمنین مرشد بے فیض تھے، وہاں والے بیعت

توڑنے کے لئے مجبور تھے، سید صاحب کے ارشادات، ہجرت ثانیہ کے بعد کے فرمودات اور غیبت کی داستانیں شان ولایت کے خلاف ہیں، ان میں اتحاد کی بوباس نہیں، انہیں ہر وقت شرک ہی شرک کے خواب نظر آئے، اسی بدحواسی میں بچوں کے مقام پر فرمایا کہ میں جہاد کو کھیل سمجھتا تھا۔ (۱) سوانح سازوں نے جو حالات لکھے ہیں ان کے متعلق ان کی روح بر ملا کہہ رہی ہے:

من از بیگانگان ہر گز نہ نالم  
کہ با من آنچه کرد ہم آشنا کرد

شاہ اسماعیل کی تفرقہ اندازیوں اور ان کی معقولات کی جدت طرازیوں نے یہاں اور وہاں مخالفت پیدا کر دی تھی، سرحد میں رجال الغیب نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، سید صاحب انتقال کے بعد فاتحہ درود سے بھی محروم ہو گئے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد سید صاحب کے بلند و بالا دعویٰ کو عزم کا جوش کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ انہوں نے بارہا فرمایا کہ ”فقیر دریں باب باشارات عیبی مامور است و بہ بشارت لاریبی مبشر، برگز ہرگز شبہ و وساوس شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی بایں الہام ممتزج غنیمت۔ اس ینین دہانی پر ان کی غیبت بیت مانی گئی ہے، غیبت بیت کے قائل عوام ہی نہیں بلکہ مولانا ولایت علی صادق پوری جیسے علماء بھی ہیں (۲) کالے پانی میں مرتے وقت مولانا تکی علی کی زبان پر یہ شعر تھا:

کون سی رات آن ملے گا  
دن بہت انتظار میں گذرے

مولانا رشید احمد گنگوہی ان کی غیبت کو اٹکن سمجھتے ہیں، جعفر علی تھامیری کو وقت رہائی ۱۳۰۰ھ میں سید صاحب سے سلام و پیام پہنچنے کا فخر حاصل ہوا تھا، لکھتے ہیں کہ مجھے حضرت مرشدنا کی حیات اور ان کے ظہور کا ایسا یقین ہے جیسے اپنی موت کا، اور یہ بھی بتایا ہے کہ میر حیدر علی ۱۳۰۲ھ میں زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ (۳) مگر

۱۔ سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر

۱۔ مولوی ولایت علی جو شہادت سے محروم ہو گئے تھے، دہلی آئے تو زینت محل کے استاد مولوی امام علی نے ان سے بیعت کی، مولوی صاحب کا انتقال محرم ۱۲۶۹ھ میں ہوا۔ ۳۔ سید احمد شہید: ۲۰۱، ڈیٹیشن ۱۹۳۹ء



بایں ہمہ مایوس ہو کر جعفر علی تھائیسری نے مسئلہ غیبو بیت کو وہم سے بھی تعبیر کیا اور غلط سمجھا، رہا ان کا پتلا بنانا تو وہ کسی وجہ سے بھی ہو بدعت ہے، جو ان توحید پرستوں اور تقلید کے منکروں نے یاد مرشد کے لئے ایجاد کر لیا۔

سکھوں کے بیان غلط سہی مگر ان کی رائے کو غلط نہیں کہا جاسکتا، انہیں اقرار ہے کہ سید صاحب نے یہاں پہاڑی جماعتوں میں ہل چل ڈال دی تھی، مگر ان کا سخت جوش پھونس کی آگ کی طرح کا تھا، جس کا ذرا سی دیر میں شعلہ ختم ہو جاتا ہے، ان میں بگاڑنے کی قابلیت تھی سنبھالنے کی نہیں تھی۔

جعفر تھائیسری نے خون کے آنسو بہا کر حقیقت لکھ دی ہے کہ وعدہ فتح پنجاب پر مکمل وثوق تھا۔۔۔ از روئے شرع محمدی الہام ایک ظنی چیز ہے، سید صاحب کی بایں جملہ دینی اوصاف پولیٹیکل پیچیدگیوں اور علم جنگ کی طرف توجہ بالکل نہیں تھی، ان ہی دو نقصوں نے اس کے بنے کام بگاڑ کر بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا جس کی یاد سے خلقت کے دل دہلتے ہیں، اگر ان میں فن ملک گیری اور فن جنگ بھی ہوتا تو پنجاب کیا ساری دنیا کا بادشاہ ہوتا۔

مرزا حیرت دہلوی نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں، لکھتے ہیں کہ مولانا شہید کی رائے پر اعتماد کر لیا گیا کہ رنجیت سنگھ سے سرحدی ناراض ہیں، لہذا وہ سب ساتھ دیں گے، اس میں انہیں کامیابی ہو جاتی اگر ان کے عمال بے اعتدالی نہ کرتے اور مجبور نہ کرتے کہ وہ ناگوار طور پر شریعت کی پابندی کریں، اس میں سرداران سمہ و پشاور کی زر پرستی و بے ایمانی کا بھی دخل و شمول تھا۔۔۔ مقصد اشاعت دین تھا اور ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔

صاحب سیرت سید احمد شہید ابوالحسن علی ندوی اپنے قومی غم کو چھپانہ سکے، سب سے زیادہ ان کو افسوس اس بات کا ہے کہ اس تاریخ کو مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا، مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی سینکڑوں برس کے لئے ایک خواب بے تعبیر ہو گئی، شرع اور دین کا جلال اور اس کا تخت و تاج لٹ گیا

اور ہندوستان کی آزادی صدیوں کے لئے پھڑگئی، بالاکوٹ کی زمین چند مذہبی دیوانوں کا ہی مقفل نہیں بنی بلکہ بہت سے سیاسی ہوشمندوں کی بھی عبرت گاہ ہے اور سارے ہندوستان کے یکساں احترام کی مستحق ہے۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۷)

صاحب سید احمد شہید جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب کا نوحہ معقولات کے بہترین نکات اپنے اندر رکھتا ہے، فرماتے ہیں کہ:

”مگر افسوس ہے سید صاحب کی توقعات پوری نہیں ہوئیں، ان کی (یعنی سرحد والوں کی) اسلامی حمیت بھی پائیدار نہیں نکلی اور سید صاحب کی عزیمت بہترین متاع تھی سرحد کی نااہلیت کی نذر ہو گئی، لیکن ظاہری عقل کی بنا پر سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم اور صائب تھا، جو کچھ پیش آیا اس کا علام الغیوب کے سوائے کسی اور علم نہیں۔“

حیرت ہے کہ مہر صاحب نے سید صاحب کے علم باطن سے استدلال نہیں کیا گویا اس سے انکار کر دیا، سرحد کی بات تو علیحدہ رہی، اپنی تعلیم سے انہوں نے ہندوستان میں بھی تفرقہ ڈال دیا تھا، مختصر یہ کہ یہ آہوشیوں اپنی ذاتی نسلی کے لئے ہے اور اسی اصول پر سید صاحب اور شاہ صاحب کو انہوں نے خطاب دیا ہے ”تیرھویں صدی کے دو مجاہد“۔

میرزا حیرت نے لکھا ہے کہ عظیم الشان کام کی وہ ابتداء تھی یہ انتہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ محرک جہاد کون تھا اور اس میں قیادت کے جوہر تھے یا نہیں، کیا یہ محرک مجدد کی حیثیت رکھتا تھا، یہ کہنا کہ سید صاحب پیدائشی طور پر شوق جہاد رکھتے تھے لغو ہے، اگرچہ وہ مجذوب مطلق نہیں تھے، کم از کم دسواں حصہ مجذوبیت کا رکھتے تھے، ایسا شخص رہنا نہیں ہو سکتا، لہذا میرزا حیرت کا کہنا یہ صحیح ہے کہ جہاد کا تصور شاہ اسماعیل کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، شاہ اسماعیل کو بڑا بننے کا شوق تھا، ہر زندگی میں انہوں نے نئی راہ نکالی ہے، وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور خاندانی عقیدہ وحدت الشہود کے خلاف تھے، ان کے عقائد سے علماء کو اختلاف ہوا، اسی زمانہ میں تقویت الایمان لکھی، اس کتاب میں جہاد کا مطلق ذکر نہیں ہے، ریزیدنٹ نے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہنے

کی ممانعت کر دی تو وعظ کہنے کی ریزیدنٹ سے مل کر اجازت حاصل کی، اس وقت ریزیدنٹ مٹکاف تھا (۱۸۱۱ء تا ۱۸۱۸ء) اس نے شاہ صاحب سے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ دار الحرب کا مطلب دریافت کیا اور سمجھایا کہ دراصل سکھ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ہمیں بے وجہ دشمن سمجھا جاتا ہے، یہ اشارہ شاہ اسماعیل کے لئے تازیانہ ہوا اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے انہوں نے پنجاب کا خفیہ دورہ کیا، بعد تحقیق و معائنہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سکھ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور انگریز ان مظلموں کو پناہ دے کر تسکین فرماتے ہیں، اسی لئے ان کے دماغ میں سکھوں سے جہاد کرنے کا تصور پیدا ہوا، شاہ عبدالعزیز کے فتوے میں سکھ اور انگریز دونوں سے جہاد کرنے کا مفہوم تھا، شاہ ولی اللہ پہلے ہی فرما گئے تھے کہ حکومت کرنے کی قابلیت افغانوں میں منتقل ہو گئی ہے، علاوہ ازیں شاہ اسماعیل کو انگریزوں سے پوری مدد ملنے کی امید تھی، مٹکاف کے بعد اکتوبر ۱۸۱۸ء میں دہلی کا ریزیدنٹ ہوا، مولوی عبدالحی انگریزوں کی ملازمت میں رہنے کی وجہ سے ان کے مزاج اور طبیعت سے واقف تھے، اس لئے سکھوں سے جہاد کرنے کے متعلق مولوی عبدالحی کے ذریعہ اکتوبر ۱۸۱۸ء سے مشورہ کرنا چاہتے تھے مگر مولوی عبدالحی نے انہیں روحانی بزرگ سید احمد صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا، سید صاحب اسی زمانہ میں مالوہ سے دہلی آ گئے تھے، جب شاہ اسماعیل سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس درجہ مسخر ہوئے کہ مرید ہو گئے اور ان کی روحانی صحبت میں جہاد کے تصور اور ارادہ کو فراموش کر گئے، ان تینوں صاحبان نے مختلف شہروں کا دورہ کر کے دین کی تبلیغ شروع کی، تبلیغ کے ان دوروں میں جہاد کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے، لیکن رام پور میں ایک افغانی نے سکھوں کے مظالم کی طرف توجہ دلائی تو سید صاحب متاثر ہوئے اور شاہ اسماعیل کو جہاد کے متعلق اپنا بھولا ہوا خواب یاد آ گیا اور خیال جمایا کہ نواب رامپور احمد علی خان کی سفارش سے انگریزوں کی مدد حاصل ہو سکے گی، اب سید صاحب کے تبلیغی دوروں میں جہاد کا بھی ذکر ہونے لگا، پھر اپنے وطن رائے بریلی پہنچ کر جہاد کی تیاری کی، اسی کوشش میں نواب اودھ کے یہاں لکھنؤ پہنچے تو وہاں متروک حج کے مسئلہ پر بحث چھڑی، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کرنے سے پہلے حج کرنا چاہیے، اور

عازمین حج کو اپنے صرفہ سے لے جانے کا بھی اعلان فرما دیا، انگریزوں سے مراسم رکھنے والے روساء اور نیل کے تاجروں اور ان کی وابستہ کسبیوں نے اتنا چندہ دیا کہ قافلہ حج کے مصارف کے لئے کافی سے زائد ہو گیا، شاہ صاحب جیسی بھی روحانیت کے حامل ہوں مگر ان کا اشتہار دینے والے شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی تھے، تکیہ رائے بریلی کے قیام میں سید صاحب کی کتاب ”صراط مستقیم“ لکھی گئی، حج میں عالم اسلامی کی تائید ہو جاتی مگر شاہ اسماعیل کے عقائد کی وجہ سے وہاں مسلمان برگشتہ ہو گئے، حج سے واپس آ کر سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے قدم اٹھا دیا گیا، انگریزوں سے بارہا شکایت کی گئی کہ سید صاحب کی جدوجہد انگریزی سرکار کے خلاف ہے مگر اس شکایت کو مسترد کر دیا گیا اور سید صاحب نے بھی ہر ممکن طرح یقین دلایا کہ انگریزی حکومت میں ہم خلل نہیں ڈالیں گے اور شاہ اسماعیل نے تو صاف کہہ دیا کہ جو انگریزوں کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے، جب دہلی کے راستہ سے لاہور پر حملہ کی اجازت مانگی تو انگریزی سرکار نے سمجھایا دیا کہ ہم سے اور سکھوں سے معاہدہ ہو گیا ہے کہ دریائے ستلج حد فاصل رہے گا اور دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے، چنانچہ سید صاحب نے لاہور پر حملہ کرنے کے لئے راہ دراز اختیار کی، اس میں یہ بھی فائدہ تھا کہ درمیانی بستیوں اور ریاستوں سے انہیں مدد مل سکے گی اور حج میں عالم اسلامی کی تائید حاصل ہو سکتی ہے، چونکہ اس زمانہ میں مسلمان راہ حق سے ہٹ گئے تھے اور روح جہاد ان میں نہیں رہی تھی، لہذا سید صاحب نے سیاسی عظمت کو اپنا نصب العین نہیں بنایا اور صرف احیائے اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی، دور اول میں جو برتری حاصل تھی وہ خدمت دین کا ثمرہ تھی، دور اول کو قوت کے اسباب حاصل نہیں تھے، بلکہ ان میں جہاد کی روح پیدا کر دی گئی تھی، سید صاحب اسی دور مسعود کو زندہ کرنا چاہتے تھے، بات تو صحیح ہے لیکن دور اول کی خصوصیت، قوت ایمانی سے پیدا ہونے والی فراست جیسی خوبی ان صاحبان میں تھی یا نہیں، ایسی فراست کا یہاں دور تک پتہ نہیں تھا، وحی الہی کا فراست کے ساتھ استعمال کرنا دور اول کی امتیازی شان تھی، یہ لوگ تو آنکھیں بند کر کے اندھی تقلید کے قائل تھے، لہذا وحی والہام کا ذکر کرنا بھی

فضول ہے، دور اول کی پختگی یہ تھی کہ کفار کی زیادتیوں پر بے تکلف حبشہ کو ہجرت کی، نصرت الہی یہ تھی کہ شاہ حبشہ نے ان کافر دشمنوں کی نہیں سنی اور مہاجرین کی عزت و محبت سے خاطر و مدارت کی، دور اول کی روحانی فراست یہ تھی کہ مدینہ والوں کی دعوت پر وہاں کے لئے یکدم ہجرت کی اور طرز و اخلاق سے دشمنوں اور منافقوں کو زیر کر لیا، جب کفار مکہ نے حملہ کیا تو باوجود بے سروسامانی جنگ احد و بعد میں کامیابی عطا ہوئی، یہ مٹھی بھر مسلمان نور سے معمور تھے، رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں کا تارا تھے اور اللہ رب العزت ان کا مددگار تھا، فرشتوں کی مدد آگئی، فتح ہو جانے پر دھاک بیٹھ گئی، جنگ احد میں کامیابی کے آثار نمودار ہوئے، کفار نے ہزیمت اختیار کی، مگر جو صحابہ عقب میں پہاڑی کے دہانہ پر اس حکم کے ساتھ متعین کئے گئے تھے کہ کسی حال میں اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا، مال غنیمت کی ہوس میں انہوں نے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، کفار نے بھاگتے بھاگتے اسی طرف سے حملہ کر دیا تو لینے کے دینے پڑ گئے، شان کریمی نے اس وقت جلوہ دکھایا اور دشمنوں کو پسپا ہونا پڑا اب اگر نورانی فراست والوں سے لغزش ہو سکتی ہے تو پھر علمی و عقلی فراست تو قابل ذکر ہی نہیں، فرشتے ہر طرف یہاں کی کسی لڑائی میں رجال الغیب یا جنات بھی مدد کو نہیں آئے، اب یہ عقل پر بھروسہ کرنے والے دور اول کی نقل کرنے کے کیسے مدعی ہو سکتے ہیں۔

مہر صاحب کی کتاب ”سید احمد شہید“ کے تیسویں باب میں شاہ اسماعیل نے خود اقبال کیا ہے کہ ”زمانہ رسالت میں بذریعہ وحی منافقین کے متعلق علم ہو جاتا تھا، اب وہ ذریعہ باقی نہیں رہا، اب صرف علامتوں پر حکم لگایا جاتا ہے۔“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے ہر منصوبہ کو بغیر کسی سند یا معیار کے دور صحابہ سے تشبیہ دے دی جاتی ہے، صراط مستقیم کی فصل سوئم میں بھی سید صاحب نے لکھا ہے کہ ”اپنی مرضی کے مطابق کسی کام کو رضائے الہی سمجھنا غلط ہے۔“

ان حضرات کا اعلانیہ دعویٰ ہے کہ سید صاحب نے صرف احیائے اسلامیت پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی تھی، اب انہیں کون سمجھائے کہ احیائے اسلامیت کا نتیجہ سیاسی عظمت ہے، ان مصاحبین نے سید صاحب کا ایک بازار پٹ کر دیا اور ان کی زبان

مبارک سے کہلوا یا کہ:

”میرے دل میں حکومت اور دولت کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا۔“  
 پھر خدا کے لئے بتایا جائے کہ حکومت الہیہ بنانے کے لئے پاڑ کیوں نیلے،  
 قصہ مختصر تذا کرہ نویسوں نے اپنی اپنی بولیاں بول کر اپنا دل بہلایا ہے، وہ نہ اپنے آپ کو  
 سمجھے اور نہ سید صاحب کو سمجھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆



## حقیقت واقعی

**حیران** ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں، سید صاحب کے پرانے اور نئے سوانح نویسوں کے بیانات طلسم ہوش ربا کی مثال ہیں، ان میں اختلاف و تضاد موجود ہے، لیکن عقیدت مند الہامی سمجھ کر ان پر یقین رکھتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ نئے سوانح نگاروں نے اور خصوصاً جناب مولانا غلام رسول مہر صاحب جیسے محقق نے اشرف نامہ اور سوانح میر تقی شہید کو کیوں نظر انداز کر دیا، حالانکہ یہ دونوں کتابیں سید صاحب کے سوانحوں کی مستند و مضبوط کڑی ہیں اور ان میں بے غل و غش جملہ واقعات لکھے گئے ہیں، ان دونوں مطبوعات کے اقتباس یہاں اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ عقیدت مند حضرات خود غور کر کے اصلیت کو سمجھیں۔

ٹھا کر اشرف علی خان نے اشرف نامہ میں اپنے حالات لکھے ہیں، ۱۸۰۹ء سے لے کر آخر تک مالوہ میں رہے ہیں، پنڈاریوں سے ان کے خاص تعلقات تھے اور وہاں کے راجاؤں کے یہاں ان کی رسائی تھی، ٹھا کر اشرف علی خان ٹھا کر دوندے خان رئیس کمونہ پرگنہ پتیم پور ضلع کول (علی گڑھ) کے بچھلے صاحبزادے ہیں، ٹھا کر دوندے خان نے ۱۸۰۲ء میں علی گڑھ کا قلعہ فتح کرنے میں جنرل لیک کی بھرپور مدد کی تھی اور انگریز ان کے مرہون منت بھی تھے، مگر ان کے اثرات کی وجہ سے جب کچھ نہ چلی تو خلاف معاہدہ علی گڑھ کے انگریز حاکموں نے اپنی فطرت کے مطابق ۱۸۰۵ء میں قلعہ کمونہ کا محاصرہ کر لیا، یہ محاصرہ ایک مہینے تک رہا، جب یہ سنا کہ امیر خان اپنا لشکر لے کر اپنے وطن سنبھل سے انگریزوں کو خارج کرنے کے لئے آرہے ہیں تو محاصرہ اٹھا لیا اور ٹھا کر صاحب سے صلح کر لی، نواب اکبر خان یہاں آ کر کالی ندی پر سید نور

صاحب کے یہاں مقیم ہوئے تھے، ٹھا کر دوندے خان انہیں اپنے یہاں قلعہ کمونہ میں بلا لائے، ہر چند سمجھایا کہ انگریزوں سے مقابلہ نہ کرو، اس لئے کہ انہیں ہر وقت تازہ کمک پہنچتی رہے گی اور تمہارے لشکر میں کمی واقع ہوتی رہے گی، مگر انہوں نے ایک نہ سنی، نتیجہ یہ ہوا کہ شکست کھائی، انگریزوں نے ان کا تعاقب کیا، مگر ٹھا کر دوندے خان نے بحفاظت تمام بھرت پور تک پہنچا دیا، اس کے دو برس بعد کلکٹر رسل اور کرنل گلبر نے ٹھا کر صاحب کے تین قلعوں پر یکدم حملہ کر دیا، آخر کار وہ اپنے خاندان کو خفیہ طور پر براہ بھرت پور راجہ سندھیا کی چھاؤنی میں ہوتے ہوئے اوائل ۱۸۰۹ء میں نواب امیر خان کے پاس بمقام ناگپور پہنچے اور ان کے یہاں کئی مہینہ مہمان رہے، باوجود خاطر تواضع کرنے کے امیر خان ٹھا کر صاحب کے گزارے کی کوئی مستقل صورت نہ نکال سکے، تو انہوں نے اپنے سپہ سالار محمد شاہ خان کے پاس کشن گڑھ بھیج دیا، جب یہاں بھی کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا تو ٹھا کر صاحب راجہ سندھیا کے یہاں چلے گئے، یہ خبر سن کر اب امیر خان نے انہیں ندامت و معذرت کا خط لکھا اور اپنے یہاں آنے کی التجا کی، لہذا ۱۸۱۰ء میں وہ پھر نواب امیر خان کے لشکر میں پہنچ گئے، دو ماہ بعد نواب محمد شاہ خان نے اپنی مدد لے لئے ٹھا کر اشرف علی خان کو جو دھور بلا لیا، وہاں انہوں نے اپنی بہادری کا سکہ منوالیا، لکھا ہے کہ معرکہ کھری پر نواب محمد شاہ خان کی مدد کے لئے رواں دواں گھوڑے پر جا رہے تھے کہ راہ میں ایک دیوانہ فقیر نے بددعا دی کہ بہت اتر گیا ہے، یہ نہ سمجھے کہ اس کا خطاب ان سے تھا، اس جنگ میں ان کا ہاتھ زخمی ہوا اور ساتھ والوں نے ساتھ چھوڑ دیا، پھر اتفاق یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد گھوڑے سے گرا تو ٹانگ ٹوٹ گئی، کئی سال بعد جے پور میں ملازمت مل گئی، سرکار جے پور کی بدانتظامی کی وجہ سے عرصہ تک تنخواہ نہ مل سکی تو فاتحوں کی نوبت آ گئی اور میاں ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں جا کر لشکر پر بسر کی، ایک روز رات کو مسجد میں اپنی بد قسمتی کا رونا رو رہے تھے اور دربار الہی میں فریاد کر رہے تھے کہ ایک مجذوب آ کر بیٹھ گیا اور اس نے

ایک پرچہ دیا جس میں حافظ شیرازی کے حسب ذیل دو شعر تھے:

الا اے طوطی گویائے اسرار  
مبادا خالیت شکر ز منقار  
سرت سبز و دولت خوشباد جاوید  
کہ خوش نقشے نمودی از خط یار

خدا کی شان کہ اسی صبح کو کار بستہ کھل گئے اور خزانے سے نہ صرف تنخواہ ملی بلکہ راجہ نے انہیں جاگیر بھی مرحمت فرمائی۔

سید صاحب کے تذکرہ نویسوں نے میجر آکٹر لونی کے متعلق جو بے پرکی ہوائیاں اڑائی ہیں، ان کی اشرف نامہ سے تردید ہو جاتی ہے، ٹھا کر اشرف علی خان نے لکھا ہے کہ امیر خان بے پور کے خلاف دو مہینوں سے مورچہ بنائے ہوئے تھے، اس وقت راجہ جگت سنگھ سوائے نے انگریزوں کے پاس دہلی درخواست بھیجی کہ ان کی مدد کی جائے، لہذا میجر آکٹر لونی کیشرفوج لے کر آگئے، اور امیر خان کو شکست فاش دی، اس ہنگامہ میں آکٹر لونی کے دوش بدوش ٹھا کر اشرف علی خان رہے، لہذا میجر ان سے بہت خوش تھا، اس فتح کے دو تین ماہ بعد راجہ جگت سنگھ سوائے کا انتقال ہو گیا، میجر آکٹر لونی کے ذریعہ ان ٹھا کر صاحبان کی انگریزی سرکار میں رسائی ہوئی اور ان کے بڑے بھائی رن مست خان نے جو دھپور کے ایجنٹ رابرٹ صاحب کی بھی سفارش حاصل کی۔ دہلی سے خوشنودی کے پروانے لے کر کلکتہ میں گورنر جنرل لارڈ ہیننگز کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معافی ملی اور ان ٹھا کر صاحبان کو وطن جانے کی اجازت ہو گئی، پھر یہ خاندان از سر نو موضع سوگرہ متصل کمونہ میں آباد ہوا، اشرف علی خان نو سال بعد یہاں سے علاقہ بے پور میں اپنی جاگیر لو مروائی میں رہنے کو چلے گئے، ٹھا کر اشرف علی خان فقیر دوست تھے، پنڈاریوں میں کئی مرتبہ مہینوں اور دنوں تک تین مرتبہ رہے تھے مگر انہوں نے سید صاحب کے متعلق ایک حرف بھی اپنے تذکرہ میں نہیں لکھا ہے، اگر ذرا

بھی ان کے کانوں تک سید صاحب کی بھنک پہنچ جاتی تو وہ دل و جان سے ان کے قدموں پر سر رکھتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب مالوے میں تشریف فرما نہیں ہوئے تھے، یا نواب امیر خان کے لشکر میں گننام و بے نشان زندگی گزارتے تھے، اللہ بس باقی ہوس۔

اب میر تیتو شہید کے مطبوعہ سوانح سے حسب ذیل معلومات ملتی ہیں جن پر انگلی کسی طرح نہیں رکھی جاسکتی، میر تیتو شہید جنگ پلاسی کے ۲۵ سال بعد ۱۸۷۲ء میں بنگال کے موضع چاند پور میں پیدا ہوئے تھے، اٹھارہ برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا تھا، علم حدیث پر بھی عبور حاصل تھا، عربی، فارسی و بنگالی میں بے تکان تقریر کرتے تھے، شریعت و طریقت میں دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ پہلوانی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں بھی برق تھے، وہ چاہتے تھے کہ کوئی مرشد مل جائے، لہذا تلاش مرشد میں بنگال اڑیسہ اور دہلی آگرہ تک سفر کئے، آخر کار ایک بزرگ نے بتایا کہ خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں مرشد مل سکے گا، لہذا پہلی فرصت میں وہ حج کے لئے روانہ ہو گئے، ایک بزرگ نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ تمہیں شہادت نصیب ہو گی، مکہ معظمہ میں اتفاقاً ان کی ملاقات کلکتہ کے مولانا شاہ محمد حسین سے ہوئی، انہوں نے میر صاحب کو بتایا کہ میرے پیر حضرت سید احمد رائے بریلوی یہاں موجود ہیں، اگر مناسب سمجھو تو ان سے مل لو، چنانچہ میر صاحب سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ مرید ہونے کے جملہ شرائط و اوصاف تم میں ہیں اور میں تمہیں مرید کر سکتا ہوں، اس کے تیسرے روز میر صاحب سید صاحب سے بیعت کر لی اور میر صاحب مستقل طور پر سید صاحب کی خدمت میں رہنے لگے۔

تیتو شہید نے لکھا ہے کہ اسی حج کے موقع پر سید صاحب نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علماء سے پوچھا تھا کہ ہندوستان میں جماعت جمعہ جائز ہے یا نہیں، ان

سب کا ارشاد ہوا کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس لئے وہاں جماعت جمعہ نہیں ہو سکتی، ہندوستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہندوستان کو دارالامن بنائیں، اس کے بعد ہم لوگ مدینہ منورہ سے رخصت ہو کر مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہوئے اور دمشق، مصر اور افغانستان کے تاریخی مقامات پر حاضری دیتے ہوئے براہِ خشکی رائے بریلی چلے گئے، تیسرے دن سب ساتھیوں کو گھر جانے کی اجازت دی کہ اپنے خانگی انتظامات سے فارغ ہو کر یہاں آجائیں تاکہ مختلف صوبوں اور شہروں میں تبلیغ و جہاد کے لئے چلیں، بنگالی مریدوں کو خاص تاکید کی کہ کلکتہ کے تمام بزرگوں کو مطلع کر دیں کہ ہم کلکتہ آکر سب کے مشورے سے نصب العین مقرر کریں گے۔

جب شاہ اسماعیل اور مولانا اسحاق دہلی سے آگئے تو دورہ شروع ہوا، ہر جگہ سے ایک یا دو نمائندے لے لئے جاتے تھے، بہار پہنچتے تک مجاہدین کی تعداد ایک سو تک ہو گئی اور کلکتہ تک یہ تعداد دو سو ہو گئی، روانگی حج سے پہلے دو مرتبہ کلکتہ آئے تھے، پہلی ہی مرتبہ بیگم شمس النساء خانم ان کی مرید ہو گئی تھیں اور انہوں نے اپنے یہاں ”بگان باڑی“ میں ٹھہرایا تھا، اس کے بعد دوسری مرتبہ بھی یہاں ہی جلوہ افروز ہوئے تھے مگر معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے کس بنیاد پر لکھ دیا ہے کہ سید صاحب نے وکیل سرکار امین الدین کے یہاں قیام فرمایا تھا، اب جب سید صاحب نے کلکتہ میں نزول فرمایا تو یہاں کے مریدوں نے صرف تشریف آوری کی خبر کر دی تھی بلکہ فرید پور، حکیم پور، رسول پور اور رنگ پور وغیرہ کے لوگوں کو رضا کارانہ طور پر سید صاحب کے جلسہ میں شرکت کے لئے بھی آمادہ کر لیا تھا، بگان باڑی میں تین دن قیام رہا، شریک ہونے والے مقتدر صاحبان میں مولانا عبدالباری خان، مولانا شاہ محمد حسین، مولانا شریعت اللہ، مولانا صوفی خداداد خان صدیقی، مولانا کرامت علی جوہری، مصری سوداگر مولانا جمال الدین آفندی اور مولانا ابوالکلام کے والد ماجد مولانا خیر الدین جیسے عالم و فاضل حضرات تھے، طولِ طویل مباحثہ و مناکرہ کے بعد طے یہ ہوا کہ جہاد ضرور کیا جائے،

پٹنہ کو مرکز بنایا جائے اور اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں کھولی جائیں، تیتو شہید نے بنگالی مسلمانوں کی زبوں حالی کو واضح کیا کہ یہاں کے برہمنوں، کالیستھیوں اور راجاؤں نے مسلمانوں کو اس درجہ مجبور کر دیا ہے کہ وہ مذہب کا نام تک نہیں لے سکتے۔ ان کی اولاد کو پاٹ شالاؤں میں ہندو مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، وہ اپنے نام بنگالیوں کی طرح کے رکھنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں، داڑھیاں منڈانے اور ہندوانہ رسوم و لباس کے عادی بنا دیئے گئے ہیں، اندریں حالات تحریک جہاد یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی، لہذا میں نے طے کیا ہے کہ پہلے یہاں کے مسلمانوں کو تعلیم اسلام سے آراستہ کر دوں، مجھے امید ہے کہ ہماری اس تحریک جہاد میں نیچی ذات کے ہندو جو برہمنوں اور چھتریوں سے بیزار ہیں شریک ہو جائیں گے، اس کے بعد ہم ولایتی اور دیسی سوداگروں پر ان شاء اللہ غلبہ حاصل کر لیں گے۔

میر صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی کرامت علی جو پوری نے میری تائید کی اور اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کو کبھی ہرگز دارالحرب نہیں سمجھتے، لہذا جمعہ کی جماعت یہاں جائز ہے، اسے کبھی ترک نہ کیا جائے، ورنہ مسجدیں ویران ہو جائیں گی اور مخالفین ان پر قبضہ کر لیں گے، مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے، ہنجگانہ نماز مسجدوں میں پابندی سے ادا کیا کریں، اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہندوستان کو غیروں سے نجات ضرور ملنا چاہیے، لہذا صحیح جذبہ پیدا کر کے اور سامان مہیا کرنے کے بعد جہاد کرنا لازمی و ضروری ہے، فی الحال بنگالی مسلمان اپنی محنتگی اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہماری اس تحریک جہاد میں کھلے بندوں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ میر نثار علی عرف تیتو شہید بنگال میں مسلمانوں کو تلقین کریں اور سید صاحب انگریزوں اور سکھوں سے نجات کی کوشش فرمائیں۔

اس کے بعد میر نثار علی نے بنگال میں دین کی تبلیغ کی اور مسلمان بڑی تعداد میں اسلامی تعلیم پر عمل کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں، کالیستھیوں اور راجاؤں نے



پادریوں سے ساز کر کے انگریزوں کی سرپرستی حاصل کر لی، انگریز اپنے اثرات کو قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان متحد ہو کر ترقی نہ کرنے پائیں، ورنہ وہ ناقابل فتح قوت ہو جائیں گے، لہذا انہوں نے مسلمانوں میں نہ صرف تفرقہ ڈالنے کی تدابیر اختیار کیں کہ اسلامی ممالک سے تعلقات پیدا کر لیں گے اور قید و بند کے ذریعہ بھی بدترین مخالفت کی، میر صاحب تن تنہا نہایت مردانگی سے ان سب کا قابلہ کر کے جدوجہد کرتے رہے، مگر ان کی قسمت میں شہادت تھی، اس لئے ۱۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو جب کہ وہ مصروف عبادت تھے جنرل اسٹوارٹ نے حملہ کیا اور اس کے دو گولوں نے میر صاحب کو دربار الہی میں پہنچا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیسو شہید کی کارگزاریاں یادگار روزگار ہیں، ان ہی کے دم سے مشرقی بنگال میں اسلام اور آزادی کی شمع روشن ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ہی کی وجہ سے سید احمد صاحب کو یہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔

مجلس شوریٰ کی قرارداد کے مطابق سید احمد رائے بریلوی کو انگریزوں اور سکھوں سے جہاد کرنا تھا مگر وہ دونوں سے ایک ساتھ برسر پیکار نہیں ہو سکتے تھے، لہذا انہوں نے طے کیا کہ پہلے سکھوں کی خبر لی جائے، اس کے بعد انگریزوں کی مزاج پرسی کی جائے، مگر اس فیصلہ کے ساتھ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ سکھوں سے جہاد کرنے کے عرصہ میں انگریز ہندوستانی مسلمانوں کو کچل ڈالے گا اور یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی شمالی و جنوبی ریاستیں انگریزوں کے خلاف معاہدہ کرنا چاہتی تھیں، برخلاف اس کے انہیں انگریزوں سے سکھوں کے خلاف مدد کی امید تھی، ان ہی کوتاہیوں کو دیکھ کر جعفر تھانیسری نے خون کے آنسو بہائے ہیں کہ ”سید صاحب کو سیاست نہیں آتی تھی، اب رہا ان کا الہام تو یہ ظنی چیز ہے۔“

اب اتنے عرصہ کے بعد ان امور پر چہ میگوئیں کرنا ترضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے معتقدین آج بھی نتائج سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور اطمینان سے

بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے ہیں کہ سید صاحب آزادی دلانے کے لئے پھر نمودار ہوں گے۔

دیگر تذکرہ نویسوں کی طرح میر تیتو شہید اور مرزا حیرت دہلوی سید صاحب کی کرامتوں کے قصیدے نہیں گاتے، میر تیتو شہید نے سید صاحب کا اتباع مکمل طور پر کیا اور تن من دھن کی بازی لگا دی مگر سید صاحب کی کوشش جہاد میں استقلال دکھائی نہیں دیتا، واقعہ پشاور کے بعد سید صاحب نے جہاد سے توبہ کی اور مجاہدین کو آزاد کر کے خود ہجرت کرنے کا اعلان کر دیا اور فرمایا ہمارے ساتھ وہی آئے جو تکالیف پر مالک کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے، ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی صورت میں کہا جائے کہ سید صاحب نے دھوکہ دیا، دامن کوہ میں پہنچ کر جہاد کا سودا پھر سر میں پیدا ہو گیا اور ساتھ میں رہ جانے والے غازیوں سے اس امر پر بیعت لی کہ خواہش نفسانی وغیرہ میں اپنے اوپر مسلمان بھائیوں کو مقدم رکھا جائے اور مقام تکلیف میں خود کو مقدم خیال کیا جائے، سب ساتھیوں نے بیعت کی مگر شاہ اسماعیل نے نہیں کی اور فرمایا کہ وہ اس بیعت کو نہیں نباہ سکیں گے، اس سے شاہ اسماعیل کی فلسفیانہ مولویت اور عقیدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان دونوں صاحبان ٹھا کر اشرف علی خان اور میر تیتو کے بیانات کی حق بیانی کی موجودگی میں سید صاحب کے پرانے اور نئے تذکرہ نگاروں کے بیانات کو ہڈیاں پیسے ہی کہا جاسکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## تعلیم

بیا درید گر اینجا بود سخن فہمے  
غریب شہر سخنہائے گفتنی وارد

زمان و مکان، زمین و آسمان، فضاء و خلا، شجر و حجر، جن و انس، غرض ہر مخلوق اپنے خالق کی خود شہادت ہے، یہ ذات واجب الوجود واحد ہے اور لا شریک۔ اسم ذات اس کا ”اللہ“ ہے، اور اسمائے صفت ہزاروں ہیں، یہ صفات کسی کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود ہی ہیں اور ذاتی ہیں، اس ذات مقدس کے بغیر نہ نظام سنبھل سکتا ہے اور نہ بات بن سکتی ہے، اس کا جان لینا اور ہے اور مان لینا اور ہے، اصل پہچان دل سے ہوتی ہے، دماغ سے نہیں ہوا کرتی۔ باری تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ

”قدرت کا ظہور اسی لئے کیا ہے کہ پہچانا جاؤں۔“

اس کی معرفت کا ذریعہ اس کی کتابیں ہیں اور اس کے رسول ہیں۔ ان سے علم بھی حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ بھی۔ ورنہ قیاسی، ظنی و جذباتی طریقوں سے نہ کوئی کلیہ بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے اور اگر بنایا جائے گا تو آخر غلط ثابت ہوگا۔ بغیر رسول کے کتاب ایک معمہ ہے۔ رسول اسی لئے بھیجا جاتا ہے کہ اجمال و غوامض کی تفصیل بتائے۔ انسانی فطرت جتنی ترقی کرتی گئی اتنے ہی کتاب و رسول کے مدارج بلند ہوتے گئے۔ ہر مرتبہ نئی کتاب اور نئے رسول کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ لوگوں نے تحریف کر کے تعلیم الہی کو مسخ کر دیا، مگر جب انسانی فطرت کمال کو پہنچ گئی تو اکمل

کتاب اور اکمل رسول مبعوث کئے گئے۔ اس کتاب و نبی کا سکہ ہر زمان و مکان میں قیامت تک چلے گا۔ گویا اس طرح دین مکمل ہو گیا، اس آخری کتاب قرآن مجید نے پہلی والی تمام ساوی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ یہ جملہ قسم کے علم و حکمت سے معمور ہے، اس کی حفاظت خود رب العالمین نے اپنے ذمہ رکھی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

”اور بے شک ہم نے قرآن یاد کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، بے

کوئی یاد کرنے والا۔“ (سورہ قمر)

گویا حفظ کر دینا حفاظت کی ایک ظاہری صورت ہے، اور یہ محیر العقول ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ کوئی اور کتاب آج تک حفظ نہ کی سکی۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی زیروزبر کا فرق نہیں آیا، اس آیت قرآنی کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور اس کے مطالب کو برکس و تا کس سمجھ سکتا ہے۔ حدیث ہے کہ:

”جس نے اپنی رائے سے قرآن مجید کے متعلق کچھ کہا وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنا ٹھکانا بنا لے۔“

ایک اور حدیث ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ اس امت کی اصلاح کے لئے ہر صدی کے آغاز میں ایک ایسا

شخص بھیج دیتا ہے جو دین حق کی تجدید کرے۔“

تعلیم دین کی حفاظت و تبلیغ کا کام خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خلفائے راشدین، تابعین اور آل کے سپرد کیا ہے۔ آل میں نسبی و معنوی اولاد دونوں شامل ہیں، لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے بعد ان کی تعلیم میں تحریف کرنے والے پیدا ہو گئے۔ ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ:

میری امت میں سے بہتر فرقے پیدا ہوں گے، ایک ناجی فرقہ ہوگا جو میری راہ پر چلے گا اور عقیدہ و عمل میں ظاہر کتاب و سنت پر کار بند ہوگا۔ باقی فرقے غیر ناجی ہوں گے جو سلف صالحین کے عقیدہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ تلاش کر لیں گے۔

مختصر یہ کہ قرآن کی جامعیت، فصاحت و بلاغت، اسرار و حقائق بے مثل ہیں، بلکہ یہ کہہ دینا صحیح ہے کہ وجود نبوی خود قرآن پاک کا مظہر ہے۔

حضرت محمد ﷺ حق تعالیٰ کے آخری رسول ہیں، وہی خاتم النبیین، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین اور نبی الامی بھی ہیں۔ بعثت سے پہلے قوم نے انہیں ”امین“ کا لقب دیا تھا، ان کا اسوۂ حسنہ سارے جہان کے لئے نمونہ ہے۔ ان کے خلق عظیم کی زمین و زمان میں دھوم ہے، ان کو علم اولین و آخرین عطا کیا گیا ہے۔ وہ اپنی رحلت کے بعد بھی اپنی قبر مطہر میں زندہ ہیں، جس طرح ان کی رسالت و نبوت کامل ہے اسی طرح ان کی عبدیت بھی اکمل ہے۔ عبودیت ان کا وصف ہے۔ رسالت و نبوت ان کا عہدہ ہے ”عبدہ“ کا درجہ ”رسولہ“ پر تقدم و فوقیت رکھتا ہے۔ حضرت والا کا وجود مبارک حرف مشدد ہے۔ ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل۔ ان کو بے مثل بے مثال، ہمہ جلوۂ خدا اور ہمہ شان کبریا ہونے کی وجہ سے بجا طور پر کہا گیا ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرآن اور رسول نے شرک کو مٹایا اور توحید کو چمکایا۔ مختصراً شرک کی تشریح یہ ہے اور اہل کتاب، کفار و مشرکین کے شرک کی کئی قسمیں ہیں:

اشراک فی العلم، اشراک فی التصرف، اشراک فی العبادت اور اشراک فی العادات وغیرہ۔

جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں، ان سے یہ لوگ اپنے معبودان باطل کو متصف کرتے ہیں، ان سب باطل عقائد کی تردید کے لئے توحید کی واضح طور پر حقیقت سمجھائی گئی ہے اور وہ خصوصیات یہ ہیں:-

۱۔ اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود سمجھنا۔

۲۔ عرش و کرسی، آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے اس کا خالق اللہ تعالیٰ کو

تسلیم کرنا۔ ہر شے کا وجود اسی کی حکمت کاملہ کی وجہ سے ہے۔

۳۔ زمان و مکان میں اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے۔

۴۔ سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہی عبادت کے لائق ہے: اللہ کے واجب الوجود اور خالق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ تصرف و عبادت کے متعلق اختلاف ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم بھی ہیں۔ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے زیادہ جلیل و عظیم ہستی کے سامنے اپنے بجز و تذلل کا اظہار کیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک محتاج و غریب بادشاہ کی قدم بوسی کرتا ہے اور ایک عبد مومن اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے، ان دونوں کی صورت ایک ہے، مگر دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں۔ بادشاہ کے سامنے جھکنا، تحیت و تعظیم ہے اور رب العالمین کے سامنے سر نیاز جھکانا سجدہ عبودیت ہے، مگر بادشاہ کی قدم بوسی کے معنی اور ہیں اور اللہ کے سجدے سے مختلف ہیں بادشاہ کی عظمت فانی ہے، رب العالمین کی شان رفیع حدود و امکان کے عیوب سے منزہ و بالاتر ہے۔ بادشاہ والی عظمت کو ساجد حاصل کر سکتا ہے اور رب العالمین کی رفعت و عظمت کو ساجد کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا، مسجود کے خاص صفات، قدرت، عظمت و جلال، تسخیر و تصرف اور نفاذ کلمہ ہیں، اوصاف تکوین و تخلیق سے بجز اللہ کے کوئی بھی متصف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی انسان میں اتنی استعداد ہے مگر ذات باری تعالیٰ کے اوصاف میں سے بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جن کا بندہ میں ہونا ممکن ہے۔ چونکہ مشترکہ اوصاف کے لئے عام طور پر ایک سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور قرآن پاک میں بھی ان کے متعلق کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے اکثر کلام مقدس کے نصوص و تصریحات کو غلط معانی پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ بس اسی کا نام شرک ہے۔ ایجاد و تخلیق اور اس نوع کے دیگر تصرفات ذات بے ہمتا کے لئے مخصوص ہیں۔ ان صفات عالیہ سے بندہ و مخلوق کی مجال نہیں کہ اپنے آپ سے متصف کریں، یا ان صفات سے کوئی کسی کو موصوف سمجھے، مشرک وہ ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی کو فراموش کر کے غیروں کی پرستش کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کامل اشخاص اور



ملائکہ سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں جن کا صادر ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ لہذا غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے اور بے بصیرت لوگ ان افراد کامل و ملائکہ کی تسخیر و نفاذ کلمہ کو بعینہ خدائے بزرگ و برتر کی تسخیر و نفاذ کلمہ کی مانند سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بعض اوقات قوائے مادہ یا روحانیہ میں کسی نہ کسی طرح یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنا مظہر یا آلہ تصرف بنا لیتا ہے۔ ان کی مثال فقط آلات و جوارح کی ہوتی ہے۔ یہ اوصاف کسی دوسری ہستی میں اسی وقت ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں جبکہ وہ ہستی الوہیت کا مظہر ہو، اور الوہیت کے خصائص اس میں پائے جائیں، اس صورت میں یہ اوصاف ان کے ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کے عطا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور عطائی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات ابلیس و آدم دونوں کو عطا کئے تھے۔ ان ہی صفات کے بل پر دونوں سے اللہ کی نافرمانی سرزد ہوئی۔ سجدہ نہ کرنے کے متعلق ابلیس نے توجیہ کی۔ لہذا حجت کرنے کی وجہ سے مردود ٹھہرا، اور شجرہ ممنوعہ کھالینے پر آدم علیہ السلام نے عجز و ندامت سے معافی کی درخواست کی۔ لہذا نہ صرف معاف کئے گئے بلکہ مقبول و برگزیدہ بنائے گئے۔ انبیاء و اولیاء افضال الہی کا احساس رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھا کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو محتاج سمجھنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو صاحب ارشاد ہونے سے پہلے فنا و بقاء کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے جس سے وہ اپنی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اب شرک اس وقت ہو گا جب کسی کو کسی کمال میں مستقل بالذات تصور کیا جائے۔ اس امتیاز و فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ شرک کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں اور نہ توحید تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جن کو امتیاز کا احساس نہیں ان کا دعویٰ صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ اللہ کو بے شک اختیار ہے کہ اپنے کسی بندے کو جس حد تک بھی چاہے بعض صفات کا سزاوار اور اہل بنا دے، مگر بندے کے یہ اوصاف عطیۃ الہی ہوا کرتے ہیں۔ (مخلص از تجوہ البلاغ)

کلمہ طیب: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسلام میں ایمان کی بنیاد ہے۔ اقرار توحید و رسالت ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اس کے دو جز ہیں۔ اور پہلے جز کے دو حصے ہیں۔ لائفی کا ہے، گویا شرک سے انکار کر دیا پھر الا اللہ سے اثبات کیا اور توحید حاصل ہو گئی۔ جس طرح بلندی روشنی سے پستی و تاریکی فنا ہو جاتی ہے اسی طرح توحید سے شرک دور ہو جاتا ہے۔ شرک یقیناً بیچ ہے اور دور ہونے ہی کی شے ہے۔ کلمہ طیب کا دوسرا جز ”محمد رسول اللہ“ ہے۔ جس میں صفت و موصوف دونوں ہیں۔ یہ ایسے معظم رسول ہیں جنہیں علم و حکمت سے نوازا گیا ہے۔ وہ عقائد باطلہ کو دور کر کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم سکھاتے ہیں اور لوگوں کو پاک و مز کی بنا دیتے ہیں۔ یہ دوسرا جز پہلے جز کا صحیح ترجمہ و نقل ہے یعنی جس نے ”محمد رسول اللہ“ کو نہیں سمجھا اس نے ”الا اللہ“ کو نہیں سمجھا اور محض ”لا“ میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ جس طرح تشبیہ کفر ہے اسی طرح تزییہ بھی کفر ہے، حقیقت واقعی دونوں کے وسط میں ہے، اس دوسرے جز کی ذرا بھی تنقیص کی تو ایمان غائب اور عاقبت خراب۔ رسول کریم ﷺ کی ہدایت ہے کہ قرآن سیکھو، اور دوسروں کو سکھاؤ۔ کسی نے لطف و احترام کے ساتھ نصیحت کی ہے:-

با خدا دیوانہ باشد با محمد ﷺ ہوشیار

یہ تمہید اس لئے اٹھائی گئی ہے کہ سید احمد صاحب کی تعلیمات کو سمجھا جائے اور کوئی مفید نتیجہ نکالا جائے، اصل یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی یا تیرہویں صدی ہجری میں سلطنت مغلیہ کے زوال کی وجہ سے ہندوستان میں مرکز متزلزل ہو گیا تھا۔ زمین و آسمان کی گردشیں بدل گئی تھیں اور زندگی کا کوئی شعبہ تباہی سے نہیں بچ سکا تھا۔ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی خرابیاں اپنی صحت و درستی کے لئے کسی مصلح کی متقاضی تھیں، چنانچہ اصلاح کا بیڑا سید احمد صاحب نے اٹھایا۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور مولانا فخر الدین نے اس خرابی کو دور

کرنے کی کوشش کی، ان کے بعد سید احمد صاحب کو مصلح خیال کیا جاتا ہے، انہوں نے اصلاح معاشرت کے وہی اصول اختیار کئے جو شاہ ولی اللہ نے تجویز کئے تھے۔ اب سید صاحب کی مذہبی تعلیمات کے معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف تین ذریعے ہیں، ان کے مقلدین تقویۃ الایمان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یہ کتاب شاہ اسماعیل نے اس وقت لکھی تھی جب کہ سید صاحب پنڈاریوں میں بمقام مالوہ تشریف فرما تھے، اس وقت نہ انہیں خلافت ملی تھی اور نہ شاہ اسماعیل ان سے واقف تھے، صراط مستقیم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ دو آہ کے دورے کے بعد اپنے وطن کے قیام میں سید صاحب نے لکھوائی تھی، صراط مستقیم کو اگر صحیح مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس تقویۃ الایمان کو منسوخ کر دیا اور اگر نظر ثانی شدہ تقویۃ الایمان ہے تو مشترک مضامین کے علاوہ جو اصلاح شدہ مضامین اس میں ہیں وہ سید صاحب کے بتائے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اگر صراط مستقیم سے سید صاحب کا کوئی تعلق ہے تو حیرت ہے کہ اصلاح شدہ مضامین کو باوجود مرید ہونے کے شاہ اسماعیل نے کیوں نہیں تسلیم کیا۔ اور مشترک مضامین کو سید صاحب نے کیوں نہیں گوارا کیا اور کیوں وہ اپنے موروثی مذہب پر قائم رہے۔ سید صاحب کا ایک خط سوانح احمدی کے ضمیمہ میں موجود و محفوظ ہے جو انہوں نے علمائے سرحد کے اعتراضوں کے جواب میں شاہ اسماعیل سے لکھوایا ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ:

”یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گنہگار نہیں ہے۔ اس فقیر کو اور اس کے بزرگوں کو سب جانتے ہیں کہ اس کا آبائی مذہب حنفی ہے اور اس زمانہ میں بھی اس فقیر کے تمام اقوال و افعال حنفیہ اصول و قوانین اور ان کے ہی آئین و قواعد پر منطبق ہیں۔ ایک بھی اصول مذکورہ سے خارج نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ جو ان اصحاب سے غفلت اور بھول چوک میں صادر ہو جاتا ہے وہ اپنے قصور کا اعتراف دہکتے ہیں اور مطلع ہو جانے پر راہ راست پر آجاتے ہیں۔“

اس تحریر پر دو امور ہیں:- ایک یہ کہ اپنے متعلق حنفی ہونے کا یقین دلایا ہے، دوسرے یہ کہ الا ماشاء اللہ لکھ کر اپنے اصحاب کی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت کی ہے۔ یہ معذرت اس غلط وعظ کے متعلق ہے جو انکار تقلید کے جواز میں شاہ اسماعیل نے پنجتار کے جلسہ علماء میں دیا تھا۔ جس کو سن کر علمائے سرحد برگشتہ ہو گئے تھے اور حاوی خان بھی اپنے مرشد (حضرت اخوند عبد الغفور صاحب سوات) کے اتباع میں سید صاحب سے منحرف ہو گیا تھا اور خود سید صاحب نے اسی وقت سب کے سامنے شاہ اسماعیل کو ڈانٹ بتائی تھی کہ تمہیں ایسی لغویات نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل ہر مرتبہ اپنے عقائد کے اظہار پر معافی طلب کیا کرتے تھے، مگر اپنی توبہ پر قائم نہیں رہتے تھے۔

”امداد المشتاق“ کے صفحہ ۷۹ کے مقالہ نمبر ۱۳۴ میں حاجی امداد اللہ مہاجر کی

کی روایت درج ہے کہ:

”مولوی اسماعیل شہید موحد تھے۔ چونکہ محقق تھے، چند مسائل میں اختلاف کیا، اور مسلک پیران خود مثل شاہ ولی اللہ وغیرہ سے انکار فرمایا۔ وحدت الوجود کے قائل تھے، اور ان کے مرشد حضرت سید صاحب مسلک وحدت الشہود کا رکھتے تھے۔ باہم گفتگو ہوئی۔ سید صاحب کچھ کبیدہ ہوئے۔ عرض کیا، یہ بات اور ہے کہ دن کو رات کہیے۔ یہ حکایت مقام مخا میں واقع ہوئی تھی۔ ایک شخص نے اس کو مجھ سے بیان کیا جو اس مجلس میں حاضر تھے۔“

مولوی کرامت علی جوینوری سید صاحب کے اعظم خلفاء میں سے تھے،

انہوں نے اپنی کتاب ”نور علی نور“ میں لکھا ہے کہ:

”مرشد برحق آپ مقلد تھے اور تقلید کے خلاف جو کوئی شخص کرتا تو اپنی محفل سے نکلوا دیتے تھے اور جو تعلیم پذیر ہوتا تو مرشد برحق اس کو نصیحت کر کے راہ راست پر لاتے اور یہ بات تمام ہندوستان اور بنگالہ میں

مشہور ہے۔۔۔ فروع میں آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل نہیں تھے اور نہ اس کو اچھا سمجھتے تھے۔“

اس بیان سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل کا شمار تعلیم پذیر ہونے والوں میں تھا مگر نصیحت کو اور راہ راست پر آنے کو انہوں نے قبول نہیں کیا، بہر حال ان وجوہات کی وجہ سے سید صاحب کا تعلق صراط مستقیم سے قطعی طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ اور ان کے متعلق ایسی بدگمانی وہم میں بھی نہیں کی جاسکتی:-

معتوق ما بہ شیوہ ہر کس برابر است

باما شراب خورد بہ زاہد نماز کرد

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سید صاحب کا کوئی تعلق ان دونوں کتابوں سے نہیں ہے تو یہ تعلیم جو سید صاحب سے منسوب ہے وہ تعلیم دراصل شاہ اسماعیل کی ہے، یعنی شاہ اسماعیل کی تعلیم کچھ اور ہے اور سید صاحب کی تعلیم کچھ اور ہے۔ دونوں کو مخلوط کر دینا فتنہ سے کم نہیں، اور اس مخلوط تعلیم کے متعلق شاہ عبدالعزیز کی جو تصدیق و شہادت پیش کی جاتی ہے وہ سراسر غلط اور بہتان ہے۔ شاہ اسماعیل کے متعلق جو رائے شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ نے ظاہر کی ہے وہ ان کی طالب علمی کے زمانہ کی ہے، اس لئے وہ ان کے نئے خیالات کے اظہار کے بعد صحیح نہیں سمجھی جاسکتی۔ چونکہ سید صاحب شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی تقلید کرتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں عروج ہوا اور اسی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان دونوں کتابوں میں جو مضامین مختلف ہیں ان کی دو ایک مثالیں اقتال امر کے لئے پیش کی جاتی ہیں:

تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنفاکل پریس دہلی میں ہے کہ:

۱۔ سوائے اللہ کے چاہے ہوئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول کو بھی کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی ایسے ایسے ہیں (نقل کفر کفر نباشد) مگر صراط مستقیم مطبوعہ ضیائی پریس دہلی میں تحریر ہے کہ رسول کی ہستی تو بہت بڑی ہے اولیاء، قطب اور ابدال تک باذن الہی سب کچھ اختیار رکھتے ہیں۔“

حکیم مومن خان مومن جس طرح شاہ اسماعیل کے معتقد تھے اسی طرح مرزا غالب مولانا فضل حق خیر آبادی سے مستفیض تھے، غالب نے اپنے شعر میں یہی مضمون لکھا ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است  
لیکن کشاد آن بہ کمان محمد ﷺ است

۲۔ تقویۃ الایمان کے مطابق ”نذرونیاز و فاتحہ شرک ہے اور اس کا کرنے والا ابو جہل کی برابر مشرک ہے“۔ لیکن صراط مستقیم کے صفحہ ۷۲ پر درج ہے کہ:-  
”نہ پنداری کہ نفع رسانیدن باموات باطعام و فاتحہ خوانی خوب نیست، چہ این معنی بہتر و افضل۔“  
اور صفحہ ۹۳ پر تحریر ہے کہ:-

”پس در خوبی این قدر امر از امور مرسومہ فاتحہ و اعراس و نذرونیاز موات شک و شبہہ نیست“

اور صفحہ ۲۲ پر خواجگان چشت کی نذرونیاز کرنے کا بالتفصیل طریقہ بتایا ہے جو کشود کار کے لئے مجرب ہے۔

۳۔ تقویت الایمان میں متعدد مرتبہ یہ مفہوم درج کیا ہے:

”خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کے خود بخود ہے خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے۔ ہر طرح شرک ہے، برخلاف اس کے صراط مستقیم کے صفحہ ۲۸ پر ”علم و طاقت حاصل کرنے کے لئے مشغول دورہ کی ترکیب بتائی ہے۔“ صراط مستقیم کی تدوین میں شاہ اسماعیل اور مولوی عبدالحی کو دخل ہے، اب جو فرق تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم میں ہے وہ مولوی عبدالحی کی ترجمانی کی وجہ سے ہے۔

ان اختلافات کے علاوہ ایسی بھی متعدد مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل کو قرآن و حدیث کے معنی بدل دینے اور تحریف کرنے میں تکلف نہیں ہوتا



تھا۔ نمونہ کے طور پر ایک مثال کافی ہے:-

۱۔ شاہ اسماعیل نے سورہ فاتحہ کا ترجمہ کیا ہے۔ سب سے پہلے ایسا کعبہ و ایسا نستعین کے معنی بتا کر حیرت و غصہ کا اظہار کیا ہے کہ جب یہ اقرار و عہد ہر روز ہر نماز کی ہر رکعت میں کیا جاتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔ پھر غیر اللہ یعنی انبیاء، اولیاء، ائمہ و شہداء فرشتوں اور پریوں سے کیوں مدد مانگی جاتی ہے۔ اس کا جواب علماء نے جو دیا ہے وہ اپنی جگہ ہے، مگر شاہ صاحب کے ہمعصر مرزا غالب جب یہ اتہام سنتے سنتے اکتا گئے تو انہوں نے ایک شعر نذر کر دیا:

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار  
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اس کے بعد اهدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیہم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ ”تو ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر تیری برکت نازل ہوئی ہے اور اس راستہ سے بچا جس پر تیرا غصہ ہے۔ الذین کا لفظ اس ترجمہ میں ہارج و مانع ہے۔ وہ اپنے ترجمہ میں بجائے راستہ کے، راستہ چلنے والوں کے الفاظ لکھتے تو ان کا ترجمہ صحیح ہو جاتا، انہوں نے بجائے راستہ چلنے والوں کے راستہ کا لفظ اس لئے لکھا ہے کہ کسی کو ازکار تقلید کی تردید کا موقع نہ مل سکے۔ لہذا ایش تخریف کو بر بنائے مصلحت جائز خیال کیا۔ شاہ اسماعیل کو غالباً صراط مستقیم کے متعلق بھی مغالطہ ہے۔ وہ اسے ٹھنڈی سڑک سمجھتے ہیں جس پر تفریح کے لئے چہل قدمی کی جاتی ہے اور نہیں سمجھتے کہ اس راہ راست میں بے حد اتار چڑھاؤ ہیں اور اس پر چلنے والوں کی بے طرح آزمائش کی جاتی ہے، اتنی کہ دشمنوں کی بھی نہیں کی جاتی۔ بیشک در جنت سے ناک کی سیدہ پر آنکھوں کے سامنے ہے مگر یہ سیدھا راستہ نہایت نازک اور بے حد شفاف اور چکنا ہے۔ اس پر چلنے سے سانس پھول جاتی ہے، دم اکھڑ جاتا ہے، پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں اور ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ جب ہی تو سانس پرست اور خود نماؤں کا اس پر گزر نہیں ہوتا۔

۲۔ حدیث کا ترجمہ کیا ہے:- ”بھلا خیال تو کر جو گزرے میری قبر پر، کیا

سجدہ کرے تو اس پر۔“ پھر اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ”میں بھی ایک دن مٹی میں ملنے والا ہوں (۱)“ ناطقہ سر بہ گریبان ہے اسے کیا کہیے، رہا طریقہ محمدیہ ”صراط مستقیم“ میں اس کی ایجاد کا مقصد سید صاحب نے خود یہ بتایا ہے کہ جملہ سلسلوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ چاروں طریقوں میں رسول خدا ﷺ سے نسبت بطور باطن کے ہے اور نسبت ہمارے طریقہ محمدیہ کی رسول اللہ ﷺ سے بطور ظاہر کے ہے یعنی اس طرح شریعت کو طریقت پر ترجیح دی ہے اور آخر کار طریقت سے فرار کی صورت نکالی ہے اور بقول ان کے اپنے ایک فرضی خلیفہ عبد الرحیم فاطمی سے شہادت دلوائی ہے کہ:

”مجھے باطنی مشاغل سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب سید صاحب کے

طریقہ کے ظاہری اعمال سے مثلاً گھاس کاٹنے اور دیوار بنانے سے سب کچھ مل گیا۔ اس سے قبل اگر مر جاتا تو عاقبت خراب ہو جاتی۔“

ہر شخص جانتا ہے کہ شریعت سیکھ لینے کے بعد طریقت کی منزل آتی ہے، مگر طریقہ محمدیہ میں معاملہ دگرگوں ہے۔ یعنی حب ایمانی اور حب عشق کی ترتیب بدل کر مؤخر کو مقدم کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا خود ارشاد ہے جس سے ترتیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ”شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال ہیں۔“

شریعت و طریقت میں بظاہر دوئی معلوم ہوتی ہے مگر بایں ہمہ دونوں میں اتحاد ہے، ایک ہی زنجیر کی دونوں کڑیاں ہیں۔ اب چاروں سلسلوں کی نسبت باطنی میں نسبت ظاہری کو داخل کر کے عقل حیران ہے کہ اتحاد پیدا کیا یا تفرقہ کی بنا ڈالی۔ یہ چاروں سلسلے خود ہی پہلے سے آپس میں متحد ہیں، پھر نئی ایجاد کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔

۱۔ الکوکبۃ المشہایۃ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی تہ سہ ماہیہ نے ایسے اختلافوں اور تحریفوں کی ستر مثالیں درج کی ہیں۔

طریقہ محمدیہ کا جو اصول سید صاحب کی زبان سے کہلوایا ہے وہ سید صاحب کے مسلک کے قطعی خلاف ہے۔ لہذا یہ بھی شاہ اسماعیل کی ایجاد کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔ سید صاحب سے اس کا بھی کوئی تعلق نہیں اور شاہ عبدالرحیم فاطمی کو سید صاحب کا خلیفہ ظاہر کر کے یہ بتایا ہے کہ شاہ عبدالرحیم فاطمی کو شاہ عبدالباری امر و ہوی سے نہ فیض حاصل ہوا تھا، اور نہ خلافت ملی تھی۔ اس دعویٰ کو سن کر حاجی امداد اللہ مہاجر کی کی شاخ صابری نہیں رہتی، بلکہ نقشبندی بن جاتی ہے۔ اس کا فیصلہ حاجی صاحب کے مرید اور شاہ اسماعیل کی جماعت خود طے کرے تو بہتر ہو، ویسے حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔

شاہ اسماعیل کی تعلیم جدت سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے معیار و نظریہ کو بڑے غور و خوض سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تقویۃ الایمان کے شرک و توحید والے باب میں صفحہ پانچ پر لکھتے ہیں:

”اول سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب ہے لیکن اکثر لوگ توحید کے معنی نہیں سمجھتے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔“

یہاں لوگوں سے ان کی مراد مسلمانوں سے ہے۔ وہ شرک میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان کو شرک سے نجات دلانے کے لئے توحید کے بجائے شرک کی تفصیلات سے واقف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک توحید مرکز ہے اور اس کا دائرہ شرک ہے۔ جس نے مرکز کو محدود و مقید کر رکھا ہے، وہ وسط کے قائل نہیں ہیں اور صرف ایک حد پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں کل دائرہ شرک سے بھرا ہوا ہے۔ توحید لفظ کن سے اپنا کام بنا لیتی ہے، اسے نبیوں و لیوں اور اماموں جیسے محرم و خدمتگار کی ضرورت نہیں، برخلاف اس کے شرک کے پاس ہر قسم کے اسباب ہیں۔ اس کی فوج عظیم و کثیر ہے۔ اسی واسطے وہ توحید کے معاون و مددگار بن کر شرک کی مخالفت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ توحید کو ان کی مدد درکار نہیں ہے۔ اسی لئے ظہور اسلام سے

پہلے اہل کتاب اور بت پرست وغیرہ کے جتنے بھی شرک تھے وہ سب ہم عاصی مسلمانوں پر منطبق کر دیئے اور شرک کے متعلق جتنی بھی آیات قرآنی تھیں وہ ہم پر عائد کر دیں۔ اب جبکہ مسلمانوں کو قطعی مشرک بنا دیا تو ان کا قتل کر دینا بھی جائز ہو گیا۔ اس طرح توحید کی طرف آنے کے تمام راستے بند کر دیئے، حالانکہ توحید خود وسیع النظر ہے اور وسعت چاہتی ہے۔ اندریں حالات وہ اپنے آپ کو اپنی منہی بھر جماعت کو ہی توحید پرست سمجھتے ہیں اور خدا کا منشاء تبلیغ پورا کر دیتے ہیں۔ عام اور حقیقی مشرکین کو وہ قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ صرف مسلمانوں اور کلمہ گو یوں پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اصول و اختراع کی فہرست کچھ ایسی بنتی ہے:-

۱۔ تقلید شرک عظیم ہے۔ باپ دادا اور علماء و ائمہ کی کبھی نہ سنو۔  
 ۲۔ قرآن سمجھنے کے لئے زیادہ علم کی ضرورت نہیں، اس کو اپنے مبلغ علم کے مطابق سمجھا جاسکتا ہے۔

۳۔ وسیلہ، شفاعت اور اجماع بے معنی الفاظ ہیں۔  
 ۴۔ انبیاء و اولیاء کو قدرت نہیں، لہذا ان سے مدد مانگنا فضول ہے۔  
 ۵۔ اولیاء کا فیض اور ان کی کرامت ناقابل توجہ ہے۔  
 ۶۔ اولیاء وغیرہ کو ندا کرنا شرک ہے، محفل میلاد بدعت ہے۔  
 ۷۔ نذر و فاتحہ کی ضرورت نہیں۔  
 ۸۔ نماز میں رسول کا خیال آجانا حرام ہے۔  
 ۹۔ کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا کفر ہے۔  
 ۱۰۔ چونکہ اختیار نہیں رکھتے اس لئے انبیاء و اولیاء وغیرہ سب بھوت پریت کی برابر اور ان کی مثل ہیں۔

۱۱۔ آمین بالجہر اور رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۱۲۔ قبروں پر روشنی کرنا شرک ہے۔

۱۳۔ تصوف بدعت ہے۔

۱۴۔ تصور شیخ مشرکوں کا طریقہ ہے۔

۱۵۔ کثرت ذکر جائز نہیں۔

۱۶۔ رسول کو غیب کا علم نہیں ہے۔

۱۷۔ خاتم النبیین کا نظیر ممکن ہے۔

۱۸۔ رحلت کے بعد رسول مثل عام مردوں کے ہے، اور ان کی حیات ختم ہو

گئی۔ قیامت میں انھیں گے۔

۱۹۔ بزرگوں کے مزارات پر جانے کے لئے سواری کا انتظام کرنا شرک ہے۔

۲۰۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسماعیلی جماعت اس اختراع و اصلاح کو شاہ اسماعیل کا شاہکار سمجھتی ہے

لیکن ان کی ذاتی جدت نہیں ہے بلکہ ابن تیمیہ اور ابن عبدالوہاب کی عطا کردہ ہے۔

سب سے پہلے اپنے زمانہ میں ابن تیمیہ کی تقلید میں ابن عبدالوہاب نے

دعوئی کیا کہ میں نیا دین لے کر آیا ہوں اور یہ دعوئی اس وقت کیا تھا جبکہ امیران عرب

اقتدار کے لئے آپس میں برسر پیکار تھے، ابن عبدالوہاب نے موقع سے فائدہ اٹھا کر

اول اول امیر عینیہ سے ساز کیا، لیکن جب وہ ان سے منحرف ہو گیا تو امیر درعیہ عثمان

کی تائید و حمایت حاصل کی، مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر جہاد کا اعلان کیا اور مصر و

عرب میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس طرح دونوں کو فائدہ ہوا۔ ابن سعود کی

ریاست میں اضافہ ہوا اور ابن عبدالوہاب کی تعلیم کی اشاعت ہوئی۔ اس جوڑ توڑ کی

وجہ سے ابن عبدالوہاب کو ابن تیمیہ پر فوقیت حاصل ہے، جب ابن تیمیہ نے اپنی

جدتوں کا اعلان کیا تو حکومت نے نہ صرف باز پرس کی بلکہ متعدد قید و بند کی سزائیں بھی

دیں۔ لہذا ان کی تعلیم بار آور نہ ہو سکی، مگر ان کی شکست خوردہ ذہنیت کے جوہر اس

وقت کھلے جبکہ نو مسلم چنگیزی و مغل غازن خان نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے پہلے

وہ غازن خان کے دربار میں حاضری دے آئے تھے۔ اس نے کا ان استقبال احترام کے ساتھ کیا تھا اور ان سے دعائے برکت حاصل کی تھی۔ پھر اس نے قدر دانی و عقیدتمندی کی بنا پر ان کے کہنے سے جنگ حمص میں جو مسلمان عیسائی اور یہودی گرفتار کئے تھے ان سب کو رہائی بھی عطا کر دی تھی۔ مگر اب حملہ مصر کے وقت ابن تیمیہ نے غازن خان کے خلاف نہ صرف فتوے دیئے بلکہ کمزور مصریوں کی ہمت بھی بڑھائی اور خود جہاد میں شریک ہوئے۔ اس جہاد کی کامیابی نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے، مدعا یہ کہ ان کی تجدید سے زیادہ ان کا جہاد کامیاب رہا۔

اب یہاں ہندوستان میں ان دونوں کی تقلید میں شاہ اسماعیل نے نام اچھالا اور ایک نیک انسان سید احمد بریلوی کے پردے میں تبلیغ و جہاد کی کوشش کی، مگر مشہور ہے: نقل راجہ عقل۔ لہذا کامیابی نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ جس وقت شاہ اسماعیل نے اعلان کیا ہے انگریز تسلط جمانے کے لئے مسلمانوں کو تباہ کر رہے تھے، پادری ہندوستان کے مذاہب کی تردید کرنے کے لئے کوچہ بازار میں سرگرداں تھے۔ دیہاتی مکتبوں میں عیسوی تعلیم کی ترویج ہو رہی تھی۔ اور سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ سید صاحب کی ولایت اور شاہ اسماعیل کی علمی فضیلت ان تمام مصائب سے بے نیاز رہی اور اپنی تعلیم کا ان صاحبان نے جھنڈا بلند کیا۔ اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں ان کے فرائض میں تھا کہ کالے پادریوں کی تکذیب کرتے اور اسلام کی فوقیت ثابت کرتے مگر انہوں نے اس طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا، صرف اس لئے کہ پادری انگریز حکام کے ہم مذہب تھے اور انگریز حکام کی انہیں خاطر منظور تھی۔ اصل یہ ہے کہ انگریز نے ان کی حسب ضرورت مدد بھی کی۔ غالباً ان ہی کے اشارے سے یہاں کے مسلمانوں کو خاک بہ سر چھوڑ کر اور اپنے معتقدین کو ساتھ لے کر حج و جہاد کے حیلے سے ہندوستان سے باہر گئے تھے لیکن جب انہوں نے اس دار فانی سے سفر کیا تو اس کے چند سال بعد کچھ معمولی اسباب اور بھی ہوں مگر دراصل انگریزوں کی زیادتوں



اور کالے پادریوں کی اشاعت مسیحیت کی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں فتنہ و فساد ہوا جس کو انگریز "غدر" سے اور وطن پرست "تحریک آزادی" سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تحریک آزادی بھی سید صاحب کے جہاد کی طرح بے نتیجہ نکلی۔

"خیر خاک بر سر کن غم ایام را" مگر یہ واقعہ ہے کہ ابتداء میں انگریزوں نے جماعت اسماعیلیہ کو شہ دی پھر مطلب نکل جانے کے بعد آخر میں بری طرح آنکھیں پھیر لیں۔

بہر حال ان موحدوں کا دعویٰ اتحاد راہ دراز اختیار کر کے مسلمانوں کے اختلاف و انتشار کا باعث بنا، انہوں نے اپنی حسن قابلیت سے جزیات پر طبع آزمائی کی۔ اپنی دماغی کاوشوں سے فروعات کو چمکایا، اور کلیات کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ شرک کا خوف ان کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گیا کہ خواب میں بھی شرک ہی شرک نظر آنے لگا۔ اسی وجہ سے ان کے نظریات میں بدرجہ اتم تذبذب موجود ہے اور اس کی تصدیق و شہادت تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کے اختلافات اور مضامین سے ہو جاتی ہے۔ بالفرض انہیں اپنے معتقدات پر وثوق تھا تو درپردہ شاہ عبدالعزیز سے استفسار کیوں کئے جاتے تھے۔ فتاویٰ عزیز یہ میں ان کا سوال ایک بت پرست اور ایک عالم کے مکالمہ کی صورت میں محفوظ و موجود ہے اور وہ سوال یقیناً شاہ اسماعیل کی تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ ہے۔ ان کی یہ پریشانی محض تقلید سے انحراف کرنے اور صفات الہی، صفات انبیاء و اولیاء اور صفات انسانی میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے ہے، ان کے جملہ اختراعات ان ہی مغالطوں پر مبنی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کا اطمینان بخش جواب لا جواب ہے مگر ان کی سمجھ میں کب آنے والا تھا۔ اہل نظر اگر ذرا تفکر و تدبر سے کام لیں تو شاہ اسماعیل کی اصلاح و تعلیم میں سوائے تخریبی پہلو کے کوئی خاص تعمیری پہلو نہیں دکھائی دے گا۔

اب حضرت شاہ عبدالعزیز کا جواب ملاحظہ ہو:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ

سے ”موحد“ کا سوال اور ان کا جواب لا جواب سوال

ایک بت پرست، بت سے مدد مانگ رہا تھا، ایک عالم نے منع کیا کہ شرک مت کرو، بت پرست نے کہا کہ خدا کا شریک سمجھ کر اگر اس کی پرستش کروں تو کیسے شرک ہوگا۔ عالم نے کہا: قرآن شریف میں متواتر آیا ہے کہ ”غیر خدا سے مدد مت مانگو“ بت پرست نے کہا کہ انسان ایک دوسرے سے کیوں سوال کرتے ہیں۔ عالم نے کہا کہ انسان زندہ ہیں اور تیرے بت مثل کنہیا و کالکا وغیرہ کے مردہ ہیں۔ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے۔ بت پرست نے کہا کہ قبر والوں سے مدد اور شفاعت طلب کرتے ہو، چاہیے کہ تم پر بھی شرک عائد ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل قبور سے جو تمہارا مقصود و مراد ہے ویسا ہی کالکا کی تصویروں سے ہمارا ہے۔ ظاہری طور پر نہ قبر والے طاقت رکھتے ہیں اور نہ بت۔ اگر کہو کہ قبر والے قوت باطن سے کشائش حالات کرتے ہیں تو بہت جگہ بتوں سے بھی حاجت روائی ہوتی ہے اور اگر تم کہو کہ ہم اہل قبور سے کہتے ہیں کہ خدا سے ہمارے لئے شفاعت کیجئے تو ہم بھی بتوں سے ایسی ہی استدعا کرتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر اہل قبور سے استمداد کا جواز ثابت ہوتا ہے تو بعضے ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا اور مسانی کے پوجنے سے کیسے باز آجائیں گے؟

جواب

اس سوال میں چند جگہ اشتباہ واقع ہوا ہے۔ اس سے خبردار رہنا چاہیے تاکہ اللہ کے فضل سے سوال کا جواب اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ مدد چاہنا اور چیز ہے اور پرستش دوسری چیز ہے۔ عام مسلمان اہل قبور سے مدد چاہتے ہیں، پرستش نہیں کرتے۔

marfat.com

Marfat.com

بت پرست مدد بھی چاہتے ہیں اور پرستش بھی کرتے ہیں۔ پرستش یہ ہے کہ سجدہ کرے یا طواف کرے یا اس کے نام کو بطریق تقرب ورد کرے یا اس کے نام پر جانور ذبح کرے یا اپنے آپ کو اس کا پجاری کہے۔ اگر کوئی جاہل مسلمان اہل قبور کے ساتھ ایسا کر تو وہ فوراً کافر ہو جائے گا۔۔۔ دوسرے مدد چاہنا دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک مخلوق کا دوسرے مخلوق سے مدد چاہنا۔ جیسے امراء و بادشاہ سے نوکر اور فقیر مدد چاہتے ہیں اور عوام الناس اولیاء سے چاہتے ہیں کہ جناب الہی میں ہماری حاجت عرض کیجئے اس قسم کی مدد شرع میں زندہ و مردہ دونوں سے جائز ہے۔ دوسرا طریقہ مدد چاہنے کا یہ ہے کہ جو چیزیں بالاستقلال جناب الہی کے ساتھ خاص ہیں جیسے بیٹا دینا، مینہ برسانا، بیماری دور کرنا، عمر دراز کرنا وغیرہ کسی مخلوق سے چاہے اور اللہ سے دعا و سوال کرنا نیت میں نہ ہو۔ (یعنی یہ سمجھے کہ یہ چیزیں یہ بزرگ خود دیں گے) اس طرح کی مدد مانگنا حرام مطلق بلکہ کفر ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی زندہ یا مردے سے اس قسم کی مدد چاہے تو اسلام سے خارج ہو جائے، برخلاف بت پرستوں کے کہ وہ اس قسم کی مدد اپنے معبودان باطل سے چاہتے ہیں اور اس کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ بات جو بت پرست نے کہی کہ میں اپنے بتوں سے شفاعت چاہتا ہوں، یہ بڑے دھوکے اور فریب کی بات ہے، اس لئے کہ بت پرست ہرگز شفاعت نہیں چاہتے بلکہ شفاعت کے معنی تک نہیں جانتے۔ ان کے دلوں میں شفاعت کا تصور تک نہیں ہوتا۔ شفاعت کے معنی سفارش ہیں اور سفارش یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے مطلب کو کسی اور کی خدمت میں عرض کرے۔ بت پرست اپنے مطالب کی درخواست کے وقت نہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم پروردگار کے حضور میں ہماری سفارش کر دو اور ہماری مراد اس سے پوری کروادو۔ بلکہ وہ خاص اپنے بتوں سے ہی درخواست مطلب کرتے ہیں اور بت پرست کا یہ کہنا کہ اہل قبور سے جو تمہارا مقصد ہے وہی ہمارا کالکا اور کنہیا کی تصویروں سے ہے۔ یہ بات بھی غلط درغلط ہے، اس لئے کہ جو جسم قبروں میں دفن ہیں ان کی ارواح کو ان کے ساتھ تعلق ضرور رہتا ہے کیونکہ وہ روہیں مدت دراز تک ان

جسموں میں رہی ہیں اور بت پرست اپنے معبودوں کی قبروں کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے تصویریں، پتھر، درخت اور دریا قرار دیتے ہیں کہ فلاں کی یہ صورت ہے، بغیر اس کے کہ ان چیزوں کو ان کی روحوں کے ساتھ کچھ بھی تعلق ہو یا ان کے بدن وہاں جلے ہوں، اس اختراعی قرار داد میں کچھ اثر نہیں۔ ہاں بندوں کا حاجت روا خالق اکبر ہے جو اپنی رحمانیت سے ان کی مرادیں پوری کرتا ہے اور ناداں بت پرست سمجھتے ہیں کہ یہ تمام فائدے بتوں نے پہنچائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ اپنے بندوں کے حالات جانتا ہے۔ اس کو ان کی اس زندگی میں حاجت روائی منظور ہے، چاہے یہ اپنا مطلب کسی سے بھی مانگیں مگر دیتا وہی ہے جیسے شفیق باپ اپنے چھوٹے بچے کی حاجت کو جانتا ہے اور جب وہ بچہ خدمت گار یا دایہ سے کچھ مانگتا ہے تو وہ چیز باپ دے دیتا ہے۔ ایسا ہی بتوں کا حال ہے بلکہ اہل اسلام کے قاعدے کے مطابق اہل قبور سے مانگنے والے کو اللہ ہی دیتا ہے۔۔۔ اور سائل نے یہ جو لکھا ہے کہ جب اہل قبور سے مدد چاہنی جائز ثابت ہوتی ہے تو ضعیف الاعتقاد مسلمان سیتلا و مسانی کے پوچنے سے کیسے باز آجائیں گے۔ تو جب جواب یہ ہے کہ اہل قبور سے مدد چاہنے اور سیتلا و مسانی کے پوچنے میں کئی وجہ سے فرق ہے:-

”اول: یہ کہ اہل قبور صالحین اور بزرگ لوگ ہیں جن کے حالات خوب معلوم ہیں اور سیتلا و مسانی وہی ہیں جن کی نسبت یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیسے تھے بلکہ ظاہراً معلوم ہے کہ یہ سب ان کی خیال بندی ہے۔

دوسری یہ بات ہے کہ اگر سیتلا و مسانی کو فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ کبھی تھے تو وہ خبیث ارواح اور شیطانی وجود ہوں گے جنہوں نے خلق کی ایذا رسانی پر کمر باندھ رکھی ہے (جیسا کہ ہندوؤں کے اعتقاد سے ظاہر ہے) ان کو انبیاء و اولیاء کی پاک روحوں سے کیا مناسبت۔

تیسری بات یہ ہے کہ اہل قبور سے مدد مانگنا بطریق دعا کے ہے کہ جناب الہی میں عرض کر کے ہماری حاجت روائی کر دیا کیجئے اور بتوں وغیرہ کی پرستش اس

اعتقاد کی بناء پر ہے کہ وہ قادر مستقل ہیں اور یہ اعتقاد کفر خالص ہے۔ (۱)

اس جواب سے ظاہر ہو گیا کہ نذروں اور نیازوں کا ثواب بزرگان دین کی ارواح کو پہنچانا اور بارگاہ حق میں انہیں شفیع جاننا بالکل حق اور موافق شرع ہے۔ مسلمان اہل قبور اور اولیاء کی پرستش نہیں کرتے جیسے کہ بتوں کی ہندو کیا کرتے ہیں۔ مسلمان تو صرف شفاعت چاہا کرتے ہیں مگر شاہ اسماعیل نے اپنے عقیدہ کی بناء پر شاہ عبدالعزیز کے جواب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے عقیدہ پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اپنے اختراعات پر اصرار بھی کیا ان کی جدتیں تحریف پر مبنی ہیں، اور تحریف وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اصل مضمون یا علم پر پورا عبور ہو ورنہ تحریف مہمل ٹھہرے گی۔ بتایا گیا ہے کہ تحریف کیوں کی جاتی ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں۔ تہاون و تساہل، تعمق، تشدد فی الدین اور استحسان۔ (۲)

استحسان کو فقہاء نے قیاس خفی سے موسوم کیا ہے لیکن اس کے معنی ”تشریح بالرائے“ کے ہیں۔ ابلیس نے حکم الہی کی نافرمانی کر کے اپنی رائے سے کام لیا تھا لہذا سب سے پہلے اسی نے قول بالرائے کو وضع کیا۔ تقلید سے انکار کرنے کے بعد قرآن کو بالرائے سمجھنا فرعونیت کے دروازے کھولنے کے برابر ہے۔ تحریف تنگ نظر اور متعصب بنا دیا کرتی ہے، چنانچہ شرک کی مخالفت کرنے کے سلسلہ میں ان کو نفی کرنے کی اس قدر عادت پڑ گئی کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ”شدر حال“ اور ”امکان نظیر“ جیسی لا طائل و بے سود بحثیں ایجاد کر لیں یعنی رسول اللہ ﷺ کے روضہ کی زیارت کے لئے سواری کا انتظام کرنا جائز نہیں۔ اور یہ کہ خاتم النبیین جیسا رسول پیدا کرنے کی اللہ کو قدرت ہے۔ امکان نظیر کی بحث کا فیصلہ مرزا غالب مرحوم نے بڑے لطیف انداز میں کیا ہے، جناب مہر صاحب کا ارشاد ہے کہ مولانا فضل حق صاحب کا بتایا ہوا نکتہ ہے، صحیح مگر حقیقت تو واضح کر دی۔

۱۔ فتاویٰ عزیز یہ ۲۔ تفصیل و شرح حجۃ البالغۃ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یک جہاں تاہست یک خاتم بس است      قدرت حق را نہ یک عالم بس است  
خواہد از ہر ذرہ آر دعالے ہم بود ہر عالمے را خاتمے  
ہر کجا ہنگامہ عالم بود      رحمۃ للعالمین ہم بود  
کثرت ابدائے عالم خوب تر      یا بہ یک عالم دو خاتم خوب تر  
در یکے عالم دو خاتم را مجویں      صد ہزاراں عالم و خاتم مجویں  
غالب این اندیشہ پذیرم ہے      خردہ ہم بر خویش می گیرم ہے  
اے کہ ختم المرسلین خواندہ      دانم از روئے یقینش خواندہ  
این الف لائے کہ استغراق راست      حکم ناطق معنی اطلاق راست  
منشاء ایجاد ہر عالم یکے است      گر دو صد عالم بود خاتم یکے است  
منفرد اندر کمال ذاتی است      لا جرم مثلش محال ذاتی است

زیں عقیدت بر نگر دم و السلام

نامہ را در می نور دم و السلام

شاہ اسماعیل کی دماغی قلابازیاں ذات نبوت ہی تک رہیں اور شکر ہے کہ  
کمزوری اور کم ہمتی کی وجہ سے وہ ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے ورنہ یہ کہہ سکتے تھے کہ خدا  
میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنی نفی کر سکے۔ چونکہ وہ اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتا  
اس لئے مجبور ہے۔ یہ واقعی ان کا کرم ہے کہ خدا کی نعوذ باللہ اس مجبوری کو معاف کر  
دیا۔

۱۔ شاہ اسماعیل کی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تقلید ناجائز ہے مگر انہوں نے  
اپنے اس حکم کی سند نہیں پیش کی ہے۔ خدا جانے یہ کسی پیش رو کی نقالی ہے یا شاہ  
صاحب کی اپنی ذاتی رائے اور اختراع ہے۔۔۔۔۔ لیکن اسلام میں مطلقاً تقلید اور تقلید  
مجتہدین کے ثبوت موجود ہیں۔ تقلید کا واجب و ضروری ہونا آیات قرآنی، احادیث  
نبوی، عمل امت اور اقوال مفسرین و محدثین سے روز روشن کی طرح واضح و ثابت ہے۔  
اس کا خلاف کرنے والا جاہل محض ہے۔ اس موضوع پر علماء کرام نے جامع و مانع  
کتب لکھی ہیں جن کا جواب مقلدین شاہ اسماعیل کے پاس نہیں ہے۔



۲۔ طریقت میں بیعت جولی جاتی ہے اس میں عہد لیا جاتا ہے کہ مرید مرشد کی تقلید کرے گا اور انحراف کرنے سے مرود بیعت ہو جائے گا۔ شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے بیعت ضرور کی مگر عہد کو نباہا نہیں، اس لئے کہ وہ تقلید کے منکر تھے۔

۳۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر علم و فن کی بقا و ترقی تقلید ہی پر منحصر ہے بغیر اپنے بنیادی اصول کے اور بغیر استاد کی رہنمائی کے کوئی علم و فن پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ہر علم و فن کے اصول اسلاف سے ہی منتقل و منقول ہوتے ہیں اور قول بالرائے سے کبھی فائدہ نہیں پہنچتا۔

۴۔ تقلید شخصی کا خواہ کس قدر بھی انکار کیا جائے مگر تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ غیر مقلد کہلانے والا اگر ائمہ مجتہدین کی تقلید نہیں کرے گا تو ان کی تقلید کرے گا جنہوں نے اسے تقلید کرنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ یہی چلا آتا ہے کہ یہ لوگ ائمہ اربعہ کا انکار کر کے نہ صرف ان سے کم تر درجہ کے لوگوں کے مقلد ہو جاتے ہیں بلکہ گمراہوں کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مثال جناب ابوالکلام آزاد کے حالات سے ملتی ہے۔ وہ زیر عنوان ”سرسید کی تقلید کا دور“ لکھتے ہیں:-

”اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی۔ میرا اشارہ سرسید کے مصنفات کی طرف ہے، چونکہ اس واقعہ نے میرے عقائد و افکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔۔۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گم راہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت، پھر نیچریت، نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل، جو الحاد قطعی کی ہے۔ اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے اس لئے کہ وہ نیچریت کو ہی الہاد قطعی سمجھتے تھے لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ عقائد و فکر کے توسیع و تطور کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اب اگر اس کے بعد آزادی فکر، بے قیدی و مطلق العنانی کی صورت اختیار کر لے تو بلاشبہ یہ نہایت

مفروضہ میں بھی اختیار کر سکتی ہے۔“ (۱)۔  
پھر لکھتے ہیں:-

”میں بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا۔۔۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترک تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے۔ ان ہی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ میں نے سرسید سے سب سے بڑی چیز جو اس وقت پائی تھی وہ یہی ترک تقلید تھی۔ مفسرین کی۔ فقہاء کی، محدثین کی، تمام علماء کی، تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلمات کی، اور ان کروڑوں اور ان گنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گزرے ہیں۔ تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلد اعمیٰ تھا بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا۔“ (۲)

پھر اس کا نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ بھی جناب ابوالکلام کی زبانی سنئے:

”چند دنوں کے بعد شک و اضطراب نے انکار تک رسائی پیدا کر لی۔۔۔ چند دنوں کی فکر و کش مکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کر لیا اور صبح سے نماز ترک کر دی۔“ (ص ۴۰۰) انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

غیر مقلدوں کی تقلید اور اس کے برے نتائج خود ایسے شخص نے بیان فرمائے ہیں جو آخر تک غیر مقلد ہی رہے۔

اس واقعہ کو سامنے رکھ کر اسماعیلیوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ شاہ اسماعیل کے مقلد اعمیٰ ہیں یا نہیں۔۔۔۔۔ بہر حال ہمیں تو یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

اور فرمایا گیا ہے کہ:

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (۳)

۱۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی: ۳۶۸۔ ۲۔ ایضاً: ۱۔ ۳۷۰۔  
۳۔ مسئلہ تقدیر و اجتهاد کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے ”عقد الجید“ میں جو کچھ لکھا ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔

۵۔ شرک و توحید کی حقیقت حضرت امام فخر الدین رازی کے ایک واقعہ سے بھی واضح ہو سکتی ہے۔ امام صاحب علم و فضل میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ مختلف بیش بہا تصانیف کے مالک ہیں جن میں تفسیر قرآن اور دیگر کتب بہت مشہور ہیں اور پھر بادشاہ کے محکمہ قضا کے افسر اعلیٰ بھی وہی تھے۔ شیطان کو رد کرنے کی تین سو پینسٹھ تدبیریں انہوں نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں۔ حضرت نجم الدین کبریٰ کی فقیری پر ان کی مقبولیت دیکھ کر امام صاحب کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور انہیں حضرت نجم الدین کبریٰ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ شاہزادہ بیمار ہوا اور قریب مرگ ہو گیا تو بادشاہ سے کہا گیا کہ حضرت نجم الدین کبریٰ سے دعا کے لئے رجوع کیا جائے۔ بادشاہ نے شاہ نجم الدین کو بلا بھیجا اور اپنے برابر تخت پر انہیں جگہ دی جو امام صاحب کو شاق ہوا۔ اس لئے کہ ان کو یقین تھا کہ ان کو ان سے نیچے جگہ دی جائے گی، بہر حال حضرت شیخ سے علاج اور دعا کی استدعا کی گئی تو شاہ صاحب نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ یہ حدیث کہ مومن کا جھوٹا شفا ہے صحیح ہے یا ضعیف ہے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ صحیح ہے، مگر پسینہ آگیا اور طوطے ہرن ہو گئے۔ برجستہ حضرت نجم الدین نے گزارش کی کہ امام صاحب آپ سے بڑھ کر مومن کون ہو سکتا ہے، پانی منگائیے اور بسم اللہ کہہ کر شاہزادے کو اپنا جھوٹا پانی پلا دیجئے۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ حشر و نتیجہ سمجھ کر امام صاحب کی بری حالت ہو گئی، اور حضرت نجم الدین سے اصرار کیا کہ آپ اپنا جھوٹا پانی پلا دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ کے فضل سے شاہزادے کو شفا ہو گئی۔ اس کے بعد امام صاحب کی کشمکش اور خلش اتنی بڑھی کہ اس کو دور کرنے کے لئے حضرت نجم الدین کبریٰ کے مرید ہو گئے۔ بیعت کے بعد بھی فضیلت علم کی وجہ سے چون و چرا کی عادت باقی رہی۔ آخر کار جب آخری وقت آیا اور امام صاحب پر عالم نزع طاری ہوا تو شیطان نے حملہ کیا اور امام صاحب کی لکھی ہوئی دلیلوں اور تدبیروں کا اس نے کاٹ کر دیا، ایک دلیل باقی رہی تھی کہ نجم الدین کبریٰ گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور بے تابی سے تکرار کرنا شروع کر دی۔ ”کہدے کہ اللہ کو بلا دلیل پہچانا“ اس طرح امام صاحب کا ایمان بچا اور بفضلہ خاتمہ بالخیر ہوا۔ دلیلوں پر اعتبار کرنا ایمان کی نشانی نہیں

یہی منطقی دلیلیں اعتبار و ناز کی وجہ سے شرک نہیں بلکہ شرک اکبر بن جاتی ہیں۔ اسی لئے حضرت نجم الدین نے انہیں سبق پڑھایا کہ منطق سے توبہ کرو تا کہ ایمان کامل ہو، اور خاتمہ بہ خیر ہو۔ اسلام کا لفظ خود اپنے معنی بیان کر رہا ہے۔ تسلیم کامل ہی کا نام توحید ہے۔ جملہ انبیاء و اولیاء کی زندگی بتا رہی ہے کہ اپنی رائے اور مرضی کو خدا کی رائے اور مرضی پر قربان کر دینا توحید ہے۔ اور یہ توحید بغیر تقلید کے کبھی حاصل نہیں ہوا کرتی۔ اب اگر کفار و مشرکین اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں تو ان کی باتیں اساطیر الاولین ہیں اور ان کے اصول جن پر مشرکین کا اجماع ہے۔ انسانی خامیوں سے خالی نہیں ہوتے، مگر ایک مسلمان جب اپنے سلف کا اتباع کرتا ہے تو اس کے سلف کا اصول قرآن و رسول کے وسیلہ سے خدا تک پہنچتا ہے۔ اب کوئی صاحب عقل سلف صالحین کی تقلید کو مشرکین والی تقلید سے نہ تشبیہ دے سکتا ہے اور نہ برابر سمجھ سکتا ہے۔ انکار تقلید کا بدرقہ شاہ اسماعیل کے مطابق یہ ہے کہ قرآن ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے کسی زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تشریح بالرائے کو انہوں نے تقلید پر ترجیح و فضیلت دی ہے، مگر خدا جانے وہ ”راخون فی العلم“ اور ”اولوا العلم“ کے معنی کیا بتائیں گے جو محکمات و مشابہات کو سمجھا کر قرآن تک رسائی کراتے ہیں۔ اور شک و شبہ و زلیغ کو دور کیا کرتے ہیں، اگر قرآن کے معنی ہر شخص سمجھ سکتا تو رسول اللہ ﷺ کبھی ہدایت نہ فرماتے کہ قرآن سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ اب اگر قرآن سے تقلید کے متعلق سمجھنا ہے تو انہوں نے سورۃ النساء کی چھ بیسیوں آیت پر غور کیوں نہیں کیا۔ صاف ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں انکوں کی رسمیں بتائے یعنی انبیاء و صالحین کی اور تم پر اپنی رحمت سے رجوع فرمائے اور اللہ حکمت و علم والا ہے۔

اب بھی اگر تقلید سے انکار ہے تو بتایا جائے کہ جماعت اسماعیلیہ کا وجود کس وجہ سے ہے، اور شاہ اسماعیل نے اپنی تقلید کرنے کو کیوں مجبور کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ معصوم نہ تھے۔ ان پر امامت کا بھی شبہ نہ کسی نے کیا اور نہ انہوں نے خود اعلان کیا۔

شاہ اسماعیل کی تعلیمات کے متعلق سیر حاصل مباحثے اور مناظرے ہو چکے ہیں مگر افہام و تفہیم کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ہمارے علماء اپنے عقائد کو پیش کر کے ان کے عقائد کی تردید کرتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد بھی قرآن و حدیث پر مبنی ہیں۔ لہذا ”اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا“ ضرورت ہے کہ پہلے ان کا نظریہ سمجھا جائے پھر اس کے مطابق ان سے گفتگو کی جائے، اور سمجھایا جائے کہ انہوں نے قرآن و حدیث کو کس طرح استعمال کیا ہے اور اپنے عقائد کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، جو مضامین ان کے صحیح نکلیں، ان کو تسلیم کر لیا جائے ورنہ سلسلہ نامتناہی کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ وہ غیر خدا سے مدد مانگنے کو برا سمجھتے ہیں۔ اور ہم بھی برا سمجھتے ہیں (جبکہ کسی کو مستقل بالذات مددگار سمجھا جائے) لہذا سب سے پہلے طے کیا جائے کہ غیر خدا سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ غیر خدا میں آپ اور میں سب ہی آجاتے ہیں۔ لہذا وہ ہر آفرینش اور اظہار قدرت خداوندی کو غیر سمجھتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی مقرب نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کا خدا لفظ کن سے ہر شے اور اسباب مہیا کر لیتا ہے، مگر کسی کو اپنا بنانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عادت نہیں ہے کہ کسی کو اپنی معرفت عطا کرے یا مقرب بنا کر کمالات و اختیارات سے نوازے یا کسی کو ذریعہ اور وسیلہ بنائے۔ لہذا فرشتے انبیاء وغیرہ اس کے دوست نہیں ہیں بلکہ (معاذ اللہ) مثل بت اور بھوتوں کے ہیں۔ وہ قرآن کو القاء کر سکتا تھا یا الواح کی صورت میں عطا کر سکتا تھا۔ اب جو اس نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول کریم ﷺ پر قرآن اتارا اور رسول خدا ﷺ نے قرآن ہمیں سمجھایا، یہ سب نعوذ باللہ تسلیم کئے جانے کے قابل نہیں رہے۔ جبریل علیہ السلام اور رسول کریم نہ اس کی معرفت رکھتے ہیں نہ اللہ کے دوست ہیں اور نہ خادم ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوتے تو بھوت پریت سے تشبیہ نہ دی جاتی برخلاف ان کے ہم خاصان خدا کے معترف ہیں۔ ان کی فیض رسانی کے قائل

ہیں اور ان کو بارگاہ الہی میں اپنا وسیلہ اور شفیع گردانتے ہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس طرح انہوں نے توحید کا میدان تنگ اور محدود کر دیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے ہوتے ان میں توحید غائب نہ ہو جائے اور ہم اللہ کی غیر محدود قدرت کی وسعت کو چار دانگ عالم سے بھی فزوں اور لامحدود سمجھتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے کارکن مقرر فرمائے ہیں اور مختلف کام مختلف ملائکہ اور بندوں کے سپرد کئے ہیں اور ہم اللہ کی اور اس کے انتظام کی تبلیغ و اشاعت اس قدر کرنا چاہتے ہیں کہ وہی وہ ہو جائے اور اس کے غیر کا نام نہ رہے۔ غیر کو فنا کرنے میں ان کی اور ہماری کوشش یکساں مان لی جائے تو فرق مقدم و مؤخر کا رہ جاتا ہے۔ ہم توحید کے ذریعہ شرک کو مٹاتے ہیں اور وہ شرک کی معرفت توحید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسلام سے خارج کرتے ہیں اور ہم داخل و شامل کرتے ہیں۔

۲۔ وہ کہتے ہیں کہ طعام و فاتحہ کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ ان کے نزدیک مردے مثل مٹی کے بے حس اور بے روح ہیں، اور ہم اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں۔ ثواب کا پہنچنا، عالم ارواح کی بات ہے جس کا علم انہیں نہیں ہے اور ہمیں احادیث صحیحہ، اقوال فقہاء اور تعامل اولیاء اللہ کے ذریعے ہے لہذا یہ نزاع محض ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ البتہ اتنی بات ان کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس حیلے سے محتاجوں اور مساکین کو طعام پہنچ جاتا ہے اور یہ کار خیر ہے، جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اب اگر اس مادی و ظاہری ثواب کو تسلیم کر لیں تو یہ بحث ختم ہو سکتی ہے۔

۳۔ آمین بالجہر اور رفع یدین اور قبر پر روشنی کرنے (۱) کا اختلاف ایسا نہیں

۱۔ اب توسید صاحب کی مصنوعی قبر پر روشنی کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ زائرین کی سہولتوں کا بندوبست کیا جا رہا ہے، اور نقلی قبر کی زیارت کے لئے شدرد حال کیا جاتا ہے اور بقول شیخ اکرام صاحب شاہ اسماعیل کی قبر پر نسوار چڑھا کر ختم مانی جاتی ہیں۔ پھر اختلاف کیا رہا؟ ہاں یہ قسمت کی بات ہے کہ خاوی خان کے مرشد حضرت اخوند صاحب کے مزار پر پاک و مطہر چیزیں لے جانی جاتی ہیں اور خاوی خان کو نقل کرانے والوں کے لئے تمباکو کی نسوارہ گنی ہے۔ وہابیہ جس کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔ (ناشر)



کہ دل بڑے کر لئے جائیں۔ اس پر بحث عبث ہے۔ ان امور میں ان کے اختیار کو تسلیم کر لیا جائے وہ ہمارے اختیار کو تسلیم کر لیں، اس میں کسی کا بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ اپنی اپنی پسند ہے، لہذا قصہ ختم۔ رہا قبروں کو سجدہ کرنا تو اسے ہم بھی حرام سمجھتے ہیں۔

۴۔ تصوف کے وہ منکر ہیں اور تصور شیخ کو شرک سمجھتے ہیں، بہت اچھا وہ اسے بدعت ہی سمجھیں مگر ہم اس کے قائل ہیں اور تصوف و تصور کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے بعد طریقت کا نمبر آتا ہے، جو طریقت کے درجہ میں نہیں پہنچا ہے، وہ اگر تصوف و تصور کو نہیں مانتا تو بجا ہے، یہ اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اب یا تو انہیں اپنی ناواقفیت تسلیم کر لینا چاہیے یا طریقت کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، لیکن ان کو حق نہیں ہے کہ شریعت کی اصطلاحوں سے طریقت کو جانچیں۔ شریعت خود طریقت کا راستہ بتاتی ہے، نماز فرض ہے مگر بغیر حضور قلب کے نماز، نماز نہیں ہوتی۔ یہ شریعت کا مسئلہ ہے اور حضور قلب بغیر طریقت کے حاصل نہیں ہوتا۔ حضور قلب حاصل کرنے کا ایک طریقہ تصور ہے، اور یہ مادی و ظاہری نہیں، اس لئے شریعت اس پر حکم نہیں لگا سکتی۔ وہ بغیر طریقت کے اگر یہ حضور قلب حاصل کر سکتے ہوں تو براہ کرم اس کی تدبیر بتادیں، محض زبانی تکرار سے حضور قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ یہ چوں و چرا بھی عبث ہی ٹھہری۔

۵۔ ذکر کے وہ مخالف ہیں مگر قرآن پاک اٹھتے بیٹھتے وضو بے وضو یاد الہی اور ذکر کی تاکید کرتا ہے اور کثرت ذکر کی ترغیب دیتا ہے۔ لہذا ان کی مخالفت تعجب خیز ہے، اور اگر وہ ذکر کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں تو آفرین ہے ان کی سمجھ پر۔

۶۔ وہ قرآن کو بالرائے سمجھنا چاہتے ہیں اور مفسرین کا اتباع نہیں کرنا چاہتے۔ ظاہر ہے کہ شخصی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ مغالطہ اجماع کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے مگر وہ اجماع کو غلط سمجھتے ہیں تو یہ مسئلہ الہام سے طے ہو سکتا ہے۔ الہام کی تدبیر انہیں معلوم ہوگی مگر ہم الہام کو اپنے اختیار سے باہر سمجھتے ہیں۔

۷۔ وہ وسیلہ کے مخالف ہیں۔ اس کے معنوں میں تحریف کرتے ہیں اور دور

ازکار دلائل پیش کرتے ہیں، تقلید والا نکتہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے وہ وسیلہ کی تصدیق کرتا ہے اور اسی سے اس کی اہمیت واضح و ثابت ہو جاتی ہے۔

۸۔ وہ انبیاء و اولیاء کو بھوت پریت کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں، ان کی بشریت کی وجہ سے وہ ایسا خیال رکھتے ہیں مگر عہدہ اور فرائض نبوت ادا کرنے کی وجہ سے انہیں یقیناً شرف حاصل ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں: ”گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی“ اور پھر یہ تو عقل و تہذیب کی بات ہے کہ نیک کی تشبیہ نیک ہی سے ہونا چاہیے۔

۹۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنے بعض صفات سے مزین کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ خدا را! انصاف۔ یہ تو کھلی ہوئی کم نظری اور کوتاہ اندیشی ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کو رحیم و کریم بنایا ہے اور تَخْلُقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ کی ہدایت کی ہے۔

۱۰۔ وہ کہتے ہیں کہ مرجانے کے بعد ہر امتیاز مٹ جاتا ہے اور خاصان خدا بھی مثل عام مردوں کے ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ ہم انبیاء و اولیاء کی حیات بعد الموت ان حالات و واقعات سے بھی پیش کر سکتے ہیں جو انہوں نے خود سید صاحب کے متعلق ارقام فرمائے ہیں۔ غرض ہم برزخی حیات کے قائل ہیں اور اس کا علانیہ اظہار کرتے ہیں۔ منکرین و مخالفین روحانیت کے ذریعہ اس حقیقت کو خود بھی سمجھ سکتے ہیں اور اسماعیلیہ تو سید صاحب کے دوبارہ آنے کے قائل اور منتظر ہیں۔ اس لئے یہ قیل قال فضول ہے۔

۱۱۔ وہ ایک خاطر و عاصی مسلمان کو مشرک خیال کر کے واجب القتل قرار دیتے ہیں، ہم ایک موحّد کو جو خلوص کے ساتھ اقرار رسالت نہ کرے دائرہ اسلام میں شامل نہیں کرتے اور منافق کو خارج از اسلام خیال کرتے ہیں۔ ایک کافر جب توبہ کر کے پاک و صاف بن جانے کا حق رکھتا ہے ایک خاطر مسلمان تو بدرجہ اولیٰ پاکی و صفائی کا مستحق ہے۔ ایک گنہگار کلمہ گو کی مثال مرغابی کی سی ہے جس کے پروبال آب

نجات سے نکل کر خشک اور سترے ہو جاتے ہیں۔ خاطر کلمہ گو کو شرک کا لیکچر دے کر کافر بنانے کے بجائے شفقت سے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۲۔ ہر کسی کلمہ گو مسلمان پر وہ تمام آیات قرآنی جو مشرکین کے متعلق ہیں چشم زدن میں منطبق کر دیتے ہیں اور ہم آیات رحمت سنا کر عقیدہ و عمل کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

بہ میں تفاوت رہ از کجا ست تا کجا

۱۳۔ چونکہ وہ خاصان خدا کو مردہ سمجھتے ہیں اور مردہ کو ندا کرنا صحیح نہیں اسی لئے ندا کرنے کو شرک بتاتے ہیں۔ ہمارے علماء قرآن و حدیث سے بزرگان دین کو ندا کرنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں مگر انہیں قائل کرنے کے لئے یہ ثبوت مفید نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ان کے جواب میں صرف یہ ثابت کرنا چاہیے کہ خاصان خدا مثل عام مردوں کے نہیں ہیں۔ بلکہ زندہ ہیں ان صاحبان نے یا تو سورہ آل عمران کی آیات نمبر ۲۱-۲۳ پر غور نہیں کیا۔ یا خدا جانے کوئی اور مطلب نکال لیا ہے۔ بہر حال ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، پھر تیر نشانہ پر بیٹھے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ قائل نہ ہوں۔ اور ایسا ثبوت قرآن و حدیث میں علانیہ موجود ہے۔

۱۴۔ سورہ بقرہ کی آیت میں صاف حکم ہے کہ رسول کے متعلق ذومعنی الفاظ نہیں کہنا چاہیے، بلکہ ان کی عظمت کا احترام کرنا چاہیے، مگر وہ رسول کے متعلق ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اور رکیک تشبیہوں سے کام لیتے ہیں۔ خصوصاً چمار کا لفظ ان کی زبان پر چڑھا ہوا ہے (۱) اس سے زیادہ نافرمانی، گستاخی اور سوئے ادبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ قرآن کی بعض باتیں تسلیم کرنا اور بعض باتوں سے انکار

۱۔ میں ایک مرتبہ لیبر انکواری کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ مزدوروں اور ملازمین کے بیان لے رہا تھا۔ کمیٹی کے ایک ممبر نے جو مزدوروں کا پڑھا لکھا اور مہذب نمائندہ تھا، سیکرٹری کی شان میں ناشائستہ الفاظ کہے۔ میں نے اسے تنبیہ کی، تو اس نے معذرت کی اور سمجھایا کہ ان الفاظ سے گستاخی منظور و متصور نہیں، بلکہ یہ ہمارا تکیہ کلام ہے۔ اس سے معلوم ہوا جیسی روح ویسے ہی فرشتے۔

کر دینا بندہ مومن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کی انسانیت، ان کی فصاحت و بلاغت اور ان کے اخلاق کو ان کی طلاق نے کہاں اور کیسے میٹ دیا ہے۔ کاش وہ اتنا ہی سمجھیں کہ اسلام محبت آشتی کا مدعی ہے۔ بزرگوں سے ہم نے سنا ہے کہ بے ادب بے نصیب ہوتا ہے مگر شاہد وہ انکار تقلید کی وجہ سے اس بد نصیبی کو خوش قسمتی خیال کرتے ہیں۔ مبارک ہو۔

۱۵۔ ان کی سوئے ادبی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کا تصور اور خیال آجانا گاؤں خرقہ کے خیال و تصور سے زیادہ بدتر ہے۔ یہ عقیدہ کسی توحید پرست کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قطعی جہالت کی علامت ہے۔ انہوں نے اس کی دلیل و وجہ جو بتائی وہ عجیب و غریب یعنی وہ کہتے ہیں کہ رسول کا تصور و خیال دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور گدھے اور بیل کا تصور جلد دفع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ نعمت کا اقرار کر کے خود کو نعمت سے محروم کر لیں۔ تو یہ ان کی جہالت و بد نصیبی کی بین علامت ہے مگر ہم رسول کے تصور کو نعمت و رحمت سمجھ کر سینہ سے لگائے رہتے ہیں۔  
اللهم زد فزد۔

۱۶۔ توحید و رسالت کی تصدیق ہی ایمان کی جڑ ہے۔ یہ ہمیں اور انہیں دونوں کو تسلیم ہے، مگر وہ ایمان میں عمل کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ہم اس اصول کو نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک محض تصدیق اور اقرار توحید و رسالت پر ہی ایمان مبنی ہے۔ ہم مل کو اس اقرار و تصدیق کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ عمل کی خرابی و کوتاہی کی وجہ سے تصدیق زائل نہیں ہوتی۔ ہماری خطاؤں کی دربار الہی میں بنی شفاعت کریں گے۔ ہمارے لئے درتوبہ کھلا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ازراہ فضل و کرم مومنوں کی خطائیں معاف کر دینے کی خود بھی امید دلائی ہے۔ اس کا وعدہ حق ہے۔

ہم اور وہ دونوں موحد ہیں۔ ہم دونوں کو توحید پرستی کا دعویٰ ہے۔ ہم دونوں وہم و خیال میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہمسرو شریک کسی کو نہیں مانتے۔ نہ انبیاء کو نہ اولیاء کو اور

نہ ائمہ و علماء کو۔ الوہیت صرف وحدہ لا شریک کی تنہا خصوصیت ہے۔ مگر ہمارا خدا ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ اور ان کا خدا بھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ ظلم بھی کر سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ”ان افعال کی وجہ سے ذات باری میں کوئی فتیح لازم نہیں آسکتا۔“ (۱) اب کوئی بتائے کہ عقیدہ توحید کس کا خالص ہے۔ ہمارا یا ان کا؟

وہ توحید کے قائل ہیں۔ نظام توحید کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن نظام توحید کے متعینہ منتظمین و مبلغین اور کارکنان قضا و قدر کی قدر نہیں کرتے، بلکہ اپنا ساقیاس کر کے ان کو محض ڈاکیہ اور گماشتہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاصان خدا کی تعظیم و محبت ان کے نزدیک بدعت و شرک ہے، اور چونکہ ہم ان برگزیدہ ہستیوں کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ لہذا ہم پر شرک کا گمان کیا جاتا ہے۔

وہ رسالت میں بھی بندی کی چندی نکالتے ہیں۔ ان کا مستقبل یقین نہیں بلکہ ایمان ہے کہ رسول کو علم غیب نہیں۔ رسول کو کوئی اختیار نہیں اور رسول کو حیات بعد الموت حاصل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رسول عبد و بشر ہے، مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسولوں کو عام بندوں سے اپنی بعض خصوصیات عطا کر کے ممتاز فرمایا ہے اور پھر سید المرسلین ﷺ کی خصوصیات و امتیازات تو حملہ رسولوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ یہ لوگ اپنے قیاس اور حسن ظن سے رسولوں کے متعلق جو چاہیں رائے قائم کریں مگر براہ کرم یہ بتادیں کہ رسول عربی ﷺ کے جسد اطہر کا سایہ تھا یا نہیں (۱) اور یہ بھی بتادیں کہ روحی فداہ بنی الامی علیہ الصلوٰۃ والسلام آگے پیچھے یکساں دیکھتے تھے کہ نہیں؟ اگر یہ ان معجزات کے قائل ہیں تو رسالت کے متعلق ان کی تمام چہ میگوئیاں پادر ہوا ہوئی جاتی ہیں، اور اگر ان معجزات سے انہیں انکار ہے تو اس کا فیصلہ اللہ اور رسول ﷺ ہی کر سکتے ہیں۔

۱۔ ملاحظہ ہو ”جہد المقل“ صفحہ ۷۷ مصنفہ مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی۔

۲۔ فاضل مصنف کا اس طرف خیال نہیں گیا کہ ان میں سے اکثر نے حضور ﷺ کے جسد اطہر کے سایہ ہونے کا اعلان کیا ہے مگر علمائے اہل سنت نے ان کے خیالات باطلہ کا مدلل رد کیا ہے۔ (ناشر)

جب حضور نبوی کی عبدیت نورانیت سے اس درجہ معمور تھی کہ سایہ نہیں پڑتا تو قبر مقدس میں یہی نورانیت ان کی حیات کی شہادت دے سکتی ہے۔ اس لئے کہ نور کو فنا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو محمد ﷺ کے غلام ان کی ذات نبوت سے اکتساب نور کر لینے کی وجہ سے اپنی برزخی زندگی میں مردہ تصور نہیں کئے جاسکتے۔ یہی نورانیت تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ بغیر گردن موڑے آگے پیچھے کی ہر شے ملاحظہ فرمالیا کرتے تھے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو کوئی وجہ نہیں علم اولین و آخرین عطا کرنے والے قادر مطلق جل شانہ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو علم غیب سے سرفراز فرمایا ہو اور اختیارات مرحمت نہ کئے ہوں۔ ہم سے پوچھئے تو ان معجزات کو ہم آنکھیں بند کر کے صدق دل سے مانتے ہیں۔ ہر نوعیت سے مانتے ہیں، معنایاً بھی، حرفاً بھی اور بغیر چون و چرا کے اپنے اپنے رجحان کے مطابق معجزات کی موافق یا مخالف تاویل کوئی کر بھی لے تو یہ اپنی اپنی خوشی کی بات ہے، لیکن معجزات تک عقل کی رسائی کہاں ہے۔ معجزات عقل شکن اور بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں، جسمانی و روحانی بحث تو بعد کی پیداوار ہے مگر جب صاحب معراج ﷺ نے معراج کا حال سنایا تو کفار نے مذاق اڑایا اور حضرت صدیق اکبر سے جا کر کہا کہ تمہارے نبی معراج کا حال کہہ رہے ہیں۔ ان کے فرمانے پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس جواب سے کفار شرمندہ ہو کر رہ گئے اور حضرت ابو بکر لقب صدیق سے سرفراز ہو کر صاحب ایمان لوگوں کے سردار ہو گئے۔

بہ ہیں تفاوت رہ از کجا ست تا کجا

اسماعیلی جماعت کے بنیادی اصولوں سے جو خود منجملہ فروعات ہیں، عجیب و غریب متضاد فروعات نمودار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقیدے اور عمل میں یکسانیت نہیں ہے، اور لطف یہ ہے کہ جوش عقیدت میں اپنے عمل و عقیدہ کی برہمی کا ان لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں ہے، اور اگر ہے تو تو اقرار نہیں کرتے، وہ اپنے فروعات کو اپنے اصل اصول سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا



ہے کہ فتنہ و فساد مت پھیلاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہم ایمان و امن کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

جن کے ایمان میں تیقن نہ ہو، جن کا عقیدہ تو حید مشکوک ہو، جو رسول کریم صلوٰۃ اللہ علیہ کی مسلسل اہانت کرنے کے عادی ہوں اور کلمہ گو یوں کو مشرک قرار دیتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے بحث کرنا اور تصفیہ کی امید رکھنا نہ صرف غلط ہے بلکہ تصبیح اوقات ہے۔ برسوں بلاغ باشد و بس۔

لہذا ہمارے لئے تین ہی صورتیں ہیں کہ:-

۱۔ حضور نبوی ﷺ میں التجاء کریں۔

کچھ ایسی نبی ہے کہ بنائے نہیں بنتی

بگڑی کو بنا دیجئے سلطان مدینہ

۲۔ اللہ کے سپرد کرویں وہی بہترین تصفیہ کرنے والا ہے۔

۳۔ یا ارشاد قرآن کے مطابق ان لوگوں کو سلام کر لیں۔ فقط واللہ اعلم

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## حلیہ

جناب سید احمد صاحب رائے بریلوی کی شخصیت ہندو پاک کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ معتقدین و مخالفین نے ان کے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کی تصویر شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شبیہہ اگر سامنے ہوتی تو علم قیافہ کے ذریعے اس شخصیت کے قول و فعل کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی۔ ان کی تصویر شاید اس لئے شائع نہیں کی گئی کہ شرعاً ممنوع ہے، یا اس لئے منظر عام پر نہیں آسکی کہ محفوظ نہیں رہ سکی۔ ان کی تصویر بنائے جانے کے ثبوت موجود ہیں۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ کے حوالہ سے مہر صاحب لکھتے ہیں:

”شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا، اور ایک سحر کار مصور کو مقرر کیا تا کہ ان کی تصویر ہو بہو کھینچے۔ جب اس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیئے۔ اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب (سید صاحب) کی تصویر جو انمردی کی پوسنگھ کر کہا“ آفرین“ اور منصفانہ تعریف کی۔ میں (۱) نے بھی وہ تصویر دیکھی لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بناء پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔“ (۲)

ظفر نامہ کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد مہر صاحب فرماتے ہیں:-

۱۔ یعنی دیوان امر ناتھ مصنف ظفر نامہ ۲۔ سید احمد شہید: جلد ۲، ص ۴۴۲

”اگر یہ بیان درست ہے تو کچھ معلوم نہیں وہ تصویر کیا ہوئی اور کہاں گئی؟ ممکن ہے پرانے رکارڈوں میں اس کا کچھ سراغ مل جائے۔“

مہر صاحب کی اس تحریر سے عیاں ہے کہ انہیں بھی سید صاحب کی تصویر کے محفوظ نہ رہنے کا صدمہ ہے، مگر ”تحفہ محمدیہ“ نے بتایا ہے کہ سید صاحب کی شبیہ اسماعیلیوں کے پاس بھی تھی۔ لکھا ہے کہ:

”چندہ جمع کرنے کی خاطر ۱۲۶۲ھ میں فرخ آباد میں حضرت

سید احمد صاحب کی تصویر لائے تھے۔“ (تحفہ محمدیہ مطبوعہ ۱۲۶۵ھ ص ۲۰)

اندریں حالات چند سوانح نگاروں نے سید صاحب کا حلیہ لکھ کر احسان عظیم کیا ہے مگر وہ اس قدر ناکافی ہے کہ صحیح نقشہ نہیں جمایا جاسکتا۔ اور آنکھوں کے سامنے پوری تصویر نہیں آتی، بہر حال وہ ناکافی ہی سہی مگر خاکہ ہے:-

بقول جعفر تھانیسری:-

”رنگ سرخ، ریش سفید، بروت سیاہ، قوی ہیکل، خندہ رو، دراز بینی، پوستہ ابرو، کشادہ پیشانی اور بلند قامت۔“

بروایت مرزا حیرت دہلوی:-

”رنگ سفید و سرخ، سینہ چوڑا، ہاتھ پاؤں سڈول، کلائیوں چوڑی، آنکھیں نکیلی اور چھوٹی، کندھے ذرا اٹھے ہوئے، قد نہ لمبا نہ چھوٹا بلکہ اوسط۔“

مہر صاحب نے حلیہ تو بیان نہیں کیا مگر ان کو شہ زور ثابت کرنے میں زور مارا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان میں جن یاد یو کے برابر طاقت تھی۔ (سید احمد شہید جلد اول ص ۶۰)

بہ حکایت ہنٹر:-

”قد درمیانہ، سینہ تک لمبی ڈاڑھی، کم گو، خوش اخلاق، وجدانی کیفیت میں اکثر مبتلا و سرشار۔“

یہ واقعی کرامت ہے کہ سید صاحب کے حالات، عقائد اور اعمال کی طرح ان کی شکل و شبہت میں بھی اختلاف ہے اور کوئی بھی ان کا صحیح طور پر اندازہ و احاطہ نہ کر سکا۔ تصویر و حلیہ برطرف مگر ہنٹر نے ایک ناقابل فہم بات لکھی ہے جس کو دیکھ کر

ہوش اڑ جاتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ نے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہے اور عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اس کے صحیح ہونے کا امکان ہو۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس کے بیان کی تائید ”تحفہ محمدیہ“ والے نے اور مولانا ابوالکلام نے بھی کی ہے۔ بہر حال ہنر نے لکھا ہے کہ:-

”جناب سید صاحب کی شہادت کے بعد سلسلہ کو بڑھانے کے لئے سید صاحب کا بت تیار کیا گیا اور اس کی تفصیل یہ ہے:-

”ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کی کرامت کے متعلق تحقیقات کرنا کرامت سے خالی نہیں تھا۔۔۔۔ ایک جان نثار مبلغ۔۔۔۔ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا۔۔۔ اس نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ کوہستانی علاقہ میں اس غارتگاہ ضرور پہنچے گا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے امام کو چھپا رکھا ہے، جب وہ اس خانقاہ کے دروازے کے اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس سے بھرے ہوئے موجود ہیں، یہ مبلغ وہاں سے بھاگا اور مریدوں کو خط لکھا:-

”ملا قادر نے امام صاحب کا بت بنایا ہے مگر کسی کو دکھانے سے پہلے یہ وعدہ کر لیتا ہے کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا اور نہ ان سے بولنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ ایسا کرنے سے امام صاحب چودہ برس کے لئے گم ہو جائیں گے۔۔۔ جب بہت عرصہ تک تسلی بخش جواب نہ ملا تو لوگوں میں امام صاحب سے ہاتھ ملانے کی خواہش ہوئی مگر ملا قادر نے یقین دلایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو امام صاحب کے خادم (جوان کے پاس کھڑے ہیں۔) پستول مار دیں گے۔ (آخر کار اندر جا کر دیکھا تو) معلوم ہوا کہ بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا ہے اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سے انسانی شکل دے دی ہے۔۔۔ دریافت کرنے پر ملا قادر صاحب نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے۔ امام صاحب نے خود بطور معجزہ اپنے آپ کو ایک گھاس کے بھرے ہوئے مجسمے

کی شکل میں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا ہے۔“

(ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم ڈاکٹر صادق حسین: ۷۶)

معتقد بن سید صاحب کے نزدیک ہنٹر معتبر شخص ہے، اس لئے اس کے مندرجہ بالا بیان کو صحیح ہی سمجھا جائے گا۔ اس پر بھی دو وثقہ حضرات کی شہادتیں پیش کرنا ضروری ہیں۔ مولوی سید اشرف علی گلشن آبادی جناب سید صاحب کے ارادت مند تھے، انہوں نے اپنی تالیف ”تحفہ محمدیہ“ میں لکھا ہے ”سید احمد کا پتلا بنایا“۔

(تحفہ محمدیہ ص ۲۴ سطر ۵)

”ایک بکری کے چمڑے کی پتلے کی شکل بنا لوگوں کو فریب دینے لگے۔“

(ص ۴۷ سطر ۱)

علاوہ ازیں پتلا بنائے جانے اور دیگر کئی واقعات پر بڑی عالمانہ بحث کرنے کے بعد مولانا آزاد نے یوں اقرار کیا ہے:-

”یہ بھی مشہور ہے کہ چند چالاک اور دنیا پرست آدمیوں نے اپنی ذاتی اغراض سے واقعی ایک پتلا بنایا تھا اور کچھ دنوں تک یہ بات مشہور رہی تھی کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے اور بدستور زندہ و سلامت موجود ہیں لیکن یہ بھی چالاک آدمیوں کی کارروائی تھی اور بہت جلد کھل گئی۔ ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، ان کو وہابیت یا مولوی اسماعیل مرحوم کی جماعت سے کیا تعلق؟“ (ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ص ۳۵۷)

جناب مولانا آزاد ہنٹر کے بیان کو تسلیم کر لینے کے بعد کتنی بھی صفائی پیش کریں بات نہیں بن سکتی۔ کیونکہ بت گر سید صاحب کے مرید اور شاہ اسماعیل سے تربیت یافتہ تھے کیونکہ حاوی خان کی اولاد یا حضرت اخوند صاحب کے مرید بن کو کیا ضرورت تھی کہ ان کا بت بناتے۔ بہر حال یہ حرکت کسی کی بھی ہو اس دعوت و تبلیغ کا نتیجہ نہایت گھناؤنا نکلا اور یہی کہا جاسکتا ہے:-

از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ بت کدہ  
اے پیر رہ، بگو کہ طریق صواب چیست

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

marfat.com

Marfat.com

# تعارف

جناب پروفیسر اکبر محمد اقبال قادری مرحوم ایسے بزرگ و جلیل

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں شیخ سلیم حشتی (فتح پور سکری) عہد اکبری کے وہ بزرگ ہیں جن کے آستانہ پر اکبری جاہ و جلال بھی سجیدہ ریز رہتا تھا۔ اکبر اعظم کا ولی عہد شہزادہ سلیم، ان کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور اس کی ابتدائی پرورش بھی ان ہی روحانی شیخ کے گھر میں ان کے زیر عاطفت ہوئی۔ شیخ سلیم حشتی کے داماد شیخ اعظم فریدی فاروقی بدایونی تھے جو اربلا اور منونہ (متصل اولہ) کے ٹھاکروں سے کسی مقابلہ میں ۹۹۱ھ میں شہید ہوئے۔

مغلیہ دور میں اس خاندان کے کئی ارکان اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز رہے اور ان سے وفاداریاں اور جاں نثاریاں ظہور میں آئیں۔ قطب الدین کو کلتاش، نواب فرید، شیخ ایراہیم کشورخاں اور شیخ الہ دیا اخلاص خاں اسی زمرے میں آتے ہیں۔

انگریزی دور میں بھی اس خاندان کا اعزاز و احترام باقی رہا۔ شیخ شرف الدین ماس خاندان کے وہ بزرگ تھے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بدایوں کے کلکٹریڈورڈ کی مدد کی اور اس کو چھپاتے رکھا جس کھلم کھلا اعزاز و اکرام اور انعام و خطاب فرمائے۔ سر سید احمد خاں نے شیخ صاحب کے حالات و خدمات کا مفصل ذکر لائل محمد نس آف انڈیا، میں کیا ہے۔ شیخ شرف الدین کے ایک صاحبزادے شیخ امیر احمد تھے جن کے صاحبزادے ① خان بہادر شیخ بید محمد ② شیخ وحید احمد اور ③ خان صاحب شیخ محب احمد تھے۔



شیخ وحید احمد کا اصلی نام وحید محمد تھا لیکن وحید احمد عرف وحید میاں کے نام سے مشہور ہوئے آخر

میں اپنے نام کے ساتھ مسعود کا اضافہ کر لیا تھا۔ وہ ۱۸ مارچ ۱۸۹۳ء کو شیخوپورہ (ہندوستان) میں پیدا

ہوئے۔ حسب رواج ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی حامد علی اور مولوی

احمد الدین صاحب (مدرس مدرسہ شمس العلوم بدایوں) کے سامنے زانوئے ادب تکیا۔ وحید میاں کی طبیعت

کارجمان درس نظامی کی طرف تھا اور وہ عربی زبان و علوم کی باقاعدہ تحصیل کرنی چاہتے تھے مگر ان کے

بھائی سید محمد عرف میکومیاں نے انگریزی تعلیم کی طرف زور دیا اور وحید میاں ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول

بدایوں میں داخل ہو گئے پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور وہاں آٹھویں درجہ میں داخلہ لیا لیکن اتفاق سے کسی ساتھی

کے چچک نکل آنے کی وجہ سے عارضی قواعد و قیود سے پریشان ہو کر گھر آگئے اور پھر مراد آباد کے اسکول میں داخل ہوئے

مگر علالت کی وجہ سے شریک امتحان نہ ہو سکے بالآخر علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے

بعد میجر سید حسن بلگرامی (۱۹۰۴ء) کے کیمبرج اسکول (علی گڑھ) میں داخل ہوئے جو جعفر منزل میں کھولا گیا تھا۔

وحید میاں کی دلچسپی ٹیکنیکل مضامین میں بدرجہ غایت تھی لہذا ان کے اساتذہ نے مشورہ دیا کہ

وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جاتیں چنانچہ ۱۹۱۲ء میں وہ لندن پہنچ گئے لیکن کیمبرج اسکول (علی گڑھ

کے زمانہ کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جس سے ان کے مزاج اور آئندہ کے عزم کا اظہار ہوا،

۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا مشہور حادثہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا بہت سے مسلمان شہید

ہوئے اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا اس وقت صوبہ یو۔ پی کا گورنر مسٹرن تھا وحید میاں نے ایک مضمون بعنوان

”مستان کے نام کھلا خط“ لکھا۔ مسٹرن کو ”مستان“ لکھ کر خوب کر دار نگاری کی۔

وحید میاں کے لندن پہنچتے ہی جنگ عظیم اول (۱۹۱۸ء-۱۹۱۴ء) کا آغاز ہو گیا لہذا ان

کے گھر سے واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ انہوں نے لندن کی بجائے ہانچسٹر کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں

ایکٹریکل ڈپلومہ کے حصول کے لئے داخلہ لے لیا مگر وہاں کچھ ایسے حالات اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں

کہ انہوں نے ماچسٹر کے اسکول کو چھوڑ کر گلاسگو کی راہ لی اور ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ گھر (شخوپور) آئے۔ لیکن گھر والوں نے جنگ عظیم کی ہولناک فضا کی وجہ سے انہیں پھر واپس نہیں جانے دیا اور وہ اپنے نصاب کی تکمیل نہ کر سکے۔ انگلینڈ میں ان کا قیام تقریباً دو سال رہا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایگزیٹیکل لائن میں بمبئی اور کانپور میں مزید تجربات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کے بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم ہو گئی اور وہ کلی طور سے اپنے معاملات کے ذمہ دار ہو گئے۔

وحید میاں کی مثلث حیات کے مندرجہ ذیل تین زاویے رہے

① سیاست ② ادب ③ تصوف

انہوں نے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ریاست و امارت میں پلے بڑے ان کا خاندان انگریزی حکومت کا خاص وفادار اور مدد و معاون رہا۔ خان بہادر کے خطابات اور آئری مجسٹریٹ وغیرہ شخوپور کے فریدی شیوخ کے لیے وقف تھی۔

خود وحید میاں کے بڑے بھائی میکومیاں خان بہادر اور چھوٹے بھائی محمد احمد خان صاحب کے خطابات اور آئری مجسٹریٹ وغیرہ سے منفرد تھے۔ وحید میاں کی آزاد طبیعت نے تحریک آزادی کے کاربے رشتہ جوڑا اور مولانا محمد علی شوکت علی سے وابستگی رکھی۔ ۱۹۲۳ء میں وحید میاں ریپی کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۲۵ء میں بھی کانگریس کے ٹکڑے ریم ایلی سی منتخب ہوئے اور کونسل کے وصف کی حیثیت سے کام کیا۔

وحید میاں کبھی مورچ میں ہوتے تھے تو ان انتخابات کی کوششوں، ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی دلچسپ داستان سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پہلی بھیت میں خاص معرکہ رہا اور نوک جھوک کے واقعات ظہور پذیر ہوئے مگر کامیابی وحید کو ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں بھی وہ کانگریس کی طرف سے بیٹریسیڈنٹ کونسل منتخب ہوئے۔ جب ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو ملک آزاد ہوا تو بیلوں کی تقریبات میں وہ مہمان

خصوصی تھے انہوں نے پولیس گراؤنڈ میں پولیس کی سلامی لینے کے بعد وزیر اعلیٰ کا پیغام سنایا۔ وہ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ کو بند بچہ پنٹ کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔

وجید میاں اپنی فائلیں خود دیکھتے تھے ان پر نوٹنگ کرتے تھے، بڑی حد تک فیصلے بھی کرتے تھے اور روز کا کام روز نمٹالیا کرتے تھے دوسرے لوگ اس پر تعجب کرتے تھے۔ وجید میاں کے ایک دوسرے پارلیمنٹری سیکرٹری مولوی محفوظ الرحمن نامی (بہرائی) کے حسن اخلاق اور کارکردگی کے بھی معترف تھے۔ نامی صاحب کے علم و فضل، دیانت داری اور تفقہ فی الدین کا ان کے دل پر گہرا اثر تھا مولانا نامی نے ایک کامیاب عربی درس گاہ بہرائی کے قیام کے ساتھ ساتھ قرآن اور عربی کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک مکمل نصاب کئی جلدوں میں تالیف کیا تھا جس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی شائع ہوا تھا۔

نامی صاحب کے ایک شاگرد مولانا خالد فاخری الہ آبادی ہمکے دوست ہیں۔ وجید میاں رفیع احمد قدوائی کی پادٹی کے آدمی تھے بدایوں اور اس کے نواح میں ۱۹۴۶ء سے فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں روز بروز تیزی اور وسعت ہوتی رہی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ شیخ محمد سلیمان مرحوم (ف ۱۹۶۳ء) نے فسادات بدایوں کی مکمل روداد بدایوں ۱۹۴۶ء میں لکھی ہے جس سے اس دور کی غارت گری اور ہولناکی کا اندازہ ہوتا ہے وجید میاں اس زمانہ میں پبلک کی کوئی مدد نہ کر سکے غالباً وہ بھی مجبور تھے البتہ شیخ محمد سلیمان کے لیے وہ ضرور ڈھال ثابت ہو چکے۔ بدایوں کے کلکٹر جے۔ ڈی شکلا نے شیخ صاحب کو بند کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر وجید میاں نے آڑے آکر کلکٹر کی غلط فہمیاں دور کیں اور محمد سلیمان کو بچا لیا۔ اس صورت حال سے وہ دل گرفتہ بھی تھے شاید اسی لیے ۱۹۵۳ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔

وجید میاں جس زمانہ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس زمانہ میں انہوں نے علمی و ادبی اور وقتی مسائل پر خوب لکھا اور ریڈیو سے تقاریر بھی کیں۔ ان کی تین کتابیں ① تصوف کی اصلیت ② گرو راہ اور

(۳) اسلام مشرق میں اسی دور کی یادگار ہیں۔

وہید میاں نے ادبی میدان میں نمایاں کام کیا وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ تاریخ و تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ انہوں نے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے خالص علمی و ادبی ماہوار رسالہ ”نقیب“ فروری ۱۹۱۹ء سے جاری کیا۔ اس کے صرف ۳۶ شمارے شائع ہوئے اور جنوری ۱۹۲۲ء کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کی عمر آٹھ کم ہونی مگر ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی اور آج بھی ادبی و تحقیقی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ”نقیب“ مرحوم کا ذکر آجاتا ہے۔ اس رسالہ پر میر محمد محفوظ علی، محمد عظمت اللہ خاں اور سلطان حیدر جوش جیسے صاحب طرز ادیبوں کے ادب و انشا کی چھاپ تھی اور اسے حسن قبول حاصل تھا۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم اس طرح رقم طراز ہیں:

”نقیب“ کو ہر مہینے دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ نصیحت کا تلخ گھونٹ آسانی انشا کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ جب شوخی و ظرافت کی شکر میں اس کو ملفوف نہ کر لیجئے مگر اس میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ متانت اور سنجیدگی کا ذائقہ اس میں باقی نہیں رہتا لیکن نقیب نے جس اسلوب ادب کا متبع کیا ہے وہ اعلیٰ سنجیدہ شوخی اور بہترین مہذب و متین ظرافت کی مثال ہے۔ اس کی ہنسی زیر لب مگر اہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور بے ہاک لالابایوں کے قہقہہ کی آواز نہیں بن جاتی۔ اہل دل اس کو سمجھ کر متبسم ہو جاتے ہیں اور ناشناس اس کو نہ سمجھ کر مکر نہیں ہونے پاتے۔ ہماری زبان میں یہ صنف کلام ابھی ناپید ہے نظم میں لیجئے تو سودا و فغان اور مصحفی و جرات کے ہزلیات ہیں اور نثر جدید میں بیخ کی بلدیں مگر یہ زمین اصلاح و مرمت طلب ہے۔ سعدی سے بڑھ کر ہمارے بوڑھے ادیبوں میں کون ہو گا لیکن پند نامہ سعدی کے ساتھ ساتھ مطائبات

لے مکتوب علامہ سلیمان ندوی بنام وحید احمد مدیر نقیب بدایوں (اپریل ۱۹۲۲ء)

سعدی کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اردو میں جدید طرز پر لکھنؤ اور پٹنہ کے بعض انشا پردازوں نے داغ و غیل ڈالی مگر وقت کی محفل نے ان کو داوید کے کر تہذیب و منانت کی حد سے آگے بڑھا دیا۔ گو میں اپنے انداز عبارت میں ہیزم خشک ہوں کہ میرے اسلوب بیان کے لب پر کبھی مسکراہٹ ہی طاری نہیں ہوتی لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع نہیں جس پر نقیب کے طرز انشا کا قلم آسانی اور کامیابی کے ساتھ رواں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بدایوں کے مصنف نے تجاہل عامیہ کو دارالمصنفین کی طرح ایک ”دار المتجاہلین“ قائم کرنا چاہیے ورنہ ڈر ہے کہ ان کے بعد یہ طرز ناپید نہ ہو جائے۔“

مصوٰفطرت خواجہ حسن نظامی یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:

”نقیب الیے وقت بولا جبکہ ہماری شاہانہ سواری کا جلوس خاک بسر ہو چکا تھا

قافلہ کے نشان، خاک پر، اور اوراق تاریخ بنے ہوئے پامال نظر آتے تھے منزل ہمارے کارواں

کی پرچشم پر آب تھی۔ نقیب رسالہ میں سات سو چھیاسی کا مضمون پہلی بسم اللہ صحیح ہے

بہت خوب انداز ہے اور بہت ہی خوب عنوان ہے۔ اظہار مقصد کا فیشن اس سے

زیادہ صاف سلیس اور پُر لطف عبارت میں ممکن نہ تھا۔“

نقیب کو ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا ذرا فہرست ملاحظہ

فرمائیے۔ علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، فصاحت جنگ جلیل، ہانک پوری، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی،

مہاراجا سر کرشن پرشاد شاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزاد بیگانی، پروفیسر نواب علی، قاضی عبدالغفار، آصف علی دہلوی

سید ہاشمی فرید آبادی، نیاز فتح پوری، عظمت اللہ خاں، چودھری محمد علی ردو لوی، محفوظ الحق عظیم آبادی، کیفی چیرا کوٹی

عزیز لکھنوی، شاہ علی احسن مارہروی، سید ابو محمد ثاقب کانپوری، حامد اللہ انسر میرٹھی، ثاقب لکھنوی، خاں بہادر

۱۹۱۹ء۔ نقیب، مارچ ۱۹۱۹ء۔



مرزا سلطان احمد، محوی لکھنوی، محشر لکھنوی، آحسن سمجی، چودھری رحم علی ہاشمی وغیرہ وغیرہ۔

بدایوں کے اصحاب شعر و ادب بھی "نقیب" سے پورا پورا تعاون کرتے تھے اور ان کی تخلیقات بالالترام شائع ہوتی تھیں مندرجہ ذیل نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

میر محفوظ علی، فانی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولوی ابوالحسن، مولانا یعقوب بخش رانجہ  
سید عنایت احمد، قمر الدین احمد، محمد بن نازش، ایرار حسین قادری، بیطین احمد، امیر احمد امیر (ٹونک واسے)  
قاضی غلام امیر، ثاقب بدایونی، سید ابن علی، وامق بدایونی، چودھری محمد ابراہیم غلیل، چودھری محمد اسماعیل  
سید محمد میگو میاں — وغیرہ۔

نقیب کے تحت قدم اور کامیابی کے بارے میں قاضی میر لکھتے ہیں

"یہج میرز کاخیر مقدم جس محبت اور ہمت افزا تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے شکر یہ کے لیے فاکسار کو الفاظ تلاش کرنا گوگرداھر کی تلاش سے کم نہیں، سچ یہ ہے کہ اس تعریف کے مستحق دراصل نقیب کے قاضی مضمون نگار صاحبان ہیں جن کی بدولت محبت کے بار اور ہمت افزائی کے طے نصیب ہوئے"

اپنی کامیابی اور "نقیب" کی مقبولیت پر وحید میاں اس طرح رقمطراز ہیں۔

"میرا شنہا ہی تجربہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اگر کسی کام کو ہمت و استقلال سے شروع کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں جو تگ راہ ہو اور کوئی مدد نہیں جو غیر متوقع اور غیر مترقب طریقہ سے نہ ملے اس کا ثبوت "نقیب" کے ہر صفحہ سے مل سکتا ہے"

شروع میں "نقیب" نظامی پریس بدایوں میں چھپتا تھا مگر ستمبر ۱۹۱۹ء سے "نقیب پریس" قائم ہو گیا تھا۔ اس پریس سے فانی کاسب سے پہلا دیوان شائع ہوا جس پر وحید میاں نے مقدمہ لکھا تھا۔ نقیب

۱۹۱۹ء مارچ، ۱۹۱۹ء، ۱۹۱۹ء اگست



پریس کا ایک چھوٹا سا بک ڈپو بھی تھا۔

نقیب پریس بدایوں سے اکبر الہ آبادی کا کلیات بھی شائع ہوا تھا۔ رسالہ نقیب کی بدولت اکبر الہ آبادی سے وحید میاں کے تعلقات قائم ہو گئے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں

”نقیب جب سے وجود میں آیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ احباب کے لیے

سفرے تھے لاکر پیش کیا کروں چنانچہ اس وقت بھی ایک تحفہ سفر پیش کیا جا رہا ہے۔ میں الہ آباد

گیا تھا اور یہ سوچ کر گیا تھا کہ سنگم ضرور دیکھوں گا، امرود ضرور کھاؤں گا اور خان بہادر سید

اکبر حسین صاحب قبلہ کی قدم بوسی حاصل کر کے منائے دیر نہ ضرور پوری کروں گا دریلے

گنگ و جمن کا سنگم نہ دیکھ سکا مگر جناب پنڈت موتی لال نہرو کے ”اندر بھون“ میں مہاتما گاندھی

اور مولانا شوکت علی کے سنگم کے درشن کئے اس روز مہاتما گاندھی ”تلک میوریل اسکول“

کانگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ امرود ضرور کھائے مگر اب تک حیرت ہے کہ شہرت کا باعث

بد مزگی ہے یا گرانی، ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست فخر الدین احمد صاحب بی اے

نے جن کے یہاں میں مہمان تھا عمدہ امرود کھلا کہ بدایوں کے پیڑوں کی وقعت میرے

دل سے کم کہ فی نہ چاہی ہو۔ بید صاحب قبلہ کی زیارت حاصل ہوئی وقت بے وقت

بھی تھا اور کم بھی تاہم میری آرزو پوری ہو گئی۔ کم یوں کہوں گا کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ

کیسے ختم ہو گیا۔

وحید میاں نے اپنی اس ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ ایک مضمون میں اس طرح نقل کیا ہے۔

”اللہ مغفرت کرے، حضرت بید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کی شخصیت بھی کتنی

عجیب و عظیم تھی، کل کی سی بات ہے کہ میں ایک شام کو بعد مغرب اپنے کم فرما مولوی

لہ نقیب زمبستہ ۱۹۲۰ء سے وحید میاں کے ایک مضمون مرتبہ مارچ ۱۹۳۳ء سے مقبوس۔

قرالذین صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی کی معیت میں ان کے سلام کو حاضر ہوا۔ نہایت  
تپاک سے پیش آئے، شمع منگوائی اور اپنی بیاض میں سے مسکرا کر اپنا کلام سنا یا۔  
میں نے پنسل سے اشعار نوٹ کرنا چاہے تو قمر صاحب کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے فرمایا: تمہارے پاس تو ہمارا یہ پورا دیوان موجود ہے! جب شعر  
پڑھا۔

تہذیب مغربی میں ہے بورہ تلک معاف  
آگے جو اس سے بڑھتے، شرارت کی بات  
بے ساختہ میری زبان سے نکلا: "یہ آپ نے کیسے لکھا، فوراً دریافت کیا کیا بات،"  
اب مجھے اپنی حماقت آمیز جسارت کا احساس ہوا۔ اور ہکا بکارہ گیا۔ نہایت  
اصرار سے کہنے لگے: "کہتے کہتے! کیا بات ہے؟" طالب علمانہ گفتاری کی تو  
عادت تھی ہی، مجبور ہو کر کہہ بھی ڈالا (اور اب حماقت و افسوس ہے کہ کیوں  
کہہ ڈالا) کہ پکڑ لی سرکس کی لڑکیاں زیادہ دست درازی پر کہا کرتی ہیں۔

سن کر بہت ہنسے اور فرمایا شان پر چودہ طبق روشن ہوتے ہیں وہ اپنے ہی واقعات  
نہیں لکھتا بلکہ دوسروں کے بھی واردات لکھا کرتا ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے مدیر نقیب کے نام مندرجہ ذیل خط میں نقیب کو ایک شعر میں یوں موضوع

کیا ہے۔

"عزیز من سلم"

سے نقیب اپریل ۱۹۱۹ء۔

کیا عرض کروں۔ دل و دماغ پر قابو نہیں، جن صاحبوں سے مراسم دیرینہ  
ہیں ان کی خدمت سے ہی قاصر ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

خطرہ ہوا جو قوم کو فوج رقیب کا  
نکلا مقابلہ کو رسالہ نقیب کا  
۱۹۱۹ء

نقیب میں اکبر الہ آبادی کا کلام مسلسل شائع ہوا اور مولوی قمر الدین احمد بدایونی نے  
ایک طویل مضمون بعنوان "کلام اکبر پر ایک نظر" لکھا جو نقیب میں برابر شائع ہوتا رہا۔ اور ممکن ہے کہ ان  
کا یہی مضمون ان کی کتاب "بزم اکبر" کی تالیف کا محرک ہوا ہو۔

علامہ اقبال سے وحید میاں کے تعارف کا ذریعہ بھی نقیب ہوا۔ طرفین سے خط و کتابت  
رہی اور کبھی کبھی علامہ اقبال کا کلام "نقیب" میں اشاعت پذیر ہوتا۔ علامہ کے تین خط وحید میاں کے  
نام محفوظ رہ سکے جو اقبال نامہ حصہ اول (صفحہ ۲۲۵ تا صفحہ نمبر ۲۲۸) میں شامل ہیں۔ نقیب ستمبر ۱۹۱۹ء میں  
علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل تین شعر بخط اقبال شائع ہوئے۔ ۱۔

ازمن اے یاد صبا گوئے بہ فائزے فرنگ  
بقا را این بہ جگر می زنداں رام کست  
چشم جز رنگ گل ولالہ نہ بیندورنہ  
عقل تا باں کشود است گرفتار تراست  
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تراست  
آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تراست

وحید میاں نے علامہ اقبال کے کسی شعر کو موضوع بنا کر مضمون لکھنا چاہا تو انہوں نے  
مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر یہ بھیجی کہ اس پر مضمون لکھئے۔ ۲۔

۱۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۶ء) ص ۱۷۵

۲۔ ایضاً صفحہ ۱۷۵، ملاحظہ ہو پیام مشرق ص ۲۲۵ - ۲۲۶۔

۳۔ ایضاً ص ۱۷۶۔

تو لے کودک منش خود را ادب کن  
 یزنگ احمد خون ورگ و پوست  
 مسلمان زاده، ترک نسب کن  
 عرب نازد اگر، ترک عرب کن  
 مزید تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں لہ

”اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و  
 نلکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل  
 اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے  
 میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔“

علامہ اقبال پر وحید میاں کے دو مضمون (۱) انسان اقبال کی نظر میں اور (۲) اقبال اور نظریہ سعی و عمل  
 ان کے مجموعہ مضامین ”گرد و راه“ میں شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہونے  
 کی وجہ سے خواجہ صاحب انہیں ماموں کہا کرتے تھے اور ان کے مضامین منادی میں شائع ہوتے  
 تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے فاکس کا تعارف وحید میاں ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کے تو وہ سپاہیوں میں تھے اور ان سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔  
 قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ علی برادران کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور پرچوش اور  
 سرفروش نوجوانوں کا ایک جتھا ان کے گرد پیش تھا اس جتھے میں وحید احمد  
 صاحب تھے۔ علاوہ محمد علی کے میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا رابطہ  
 ان کا ادبی ذوق تھا اور میرے اور ان دونوں کے ادبی ذوق کے پیرمغان

مرحوم و مغفور سید محفوظ علی تھے۔۔۔۔۔ سید محفوظ علی کی صحبت میں اس زمانہ کے  
نوجوان اور ناک نقتہ سے درست و حید احمد صاحب کے ملاقات ہوئی پھر جب  
انہوں نے مرحوم (سید محفوظ علی) کے اشارے سے رسالہ نقیب نکالا  
تو اس کے صفحات پر کچھ مضامین میں نے بھی لکھے۔ (دیباچہ گردِ راہ)

پانچ سال کی اسارت کے بعد جب ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی ہوئی تو حید میاں نے نقیب کا  
ایک خاص نمبر (جنوری ۱۹۲۰ء) نکالا جو نہایت اہم ہے اس میں حید میاں کے علاوہ قاضی عبدالغفار  
میر محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ اسی خاص نمبر کے لیے علامہ اقبال  
نے شہباز و شاہین کے عنوان سے مندرجہ ذیل شعر لکھے تھے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند      قطرہ نیساں ہے زندانِ صدف سے اجمند  
مشک اذ فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند      مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند  
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر      کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہبازِ غ و زغن از بند قید صید نیست

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر نے عازم یورپ ہوتے ہوئے بحالت سفر ریل "مندرجہ ذیل خط

لکھا ہے اور غالباً پیغام خاص سے نوازا ہے لہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نبی کے گھر کا غلام ہو کر قدم بڑھانے میں یہ تامل

یہ راہ وہ راہ حق ہے غافل حسین نے جسمیں دریا

محمد علی جوہر عازم یورپ  
بحالت سفر ریل ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء

لہ نقیب جنوری ۱۹۲۰ء

نقیب کے اس خاص نمبر کے سلسلہ میں وحید میاں لکھتے ہیں یہ

”شوکت علی محمد علی کی رہائی کی تقریب مسرت میں نقیب نے یہ اہتمام کیا کہ اس کے آخری نمبر کے تمام صفحات انہیں دو بھائیوں کے لیے وقف ہوں۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ جس قدر دل چاہتا ہے اس نمبر کو بنانا چاہیے تھا اس قدر دل چاہتا ہے۔ عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہ گزارش شاید کسی قدر قابل پذیرائی ہو کہ خاکسار ایڈیٹر ۲۸ جنوری تک تقریباً ان حضرات کے ہمراہ رہا۔ باوجودیکہ اس نمبر کو شوکت علی محمد علی کے لیے وقف کرنا پیش نظر تھا پھر بھی اس عرصہ میں نقیب کے لیے کچھ سامان نہ کر سکا۔ ۲۸ جنوری کے بعد سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔“

وحید میاں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کا ”روزنامہ علی برادران“ مرتب کر کے شائع کرے جو خاصہ کی چیز ہے۔

غرض نقیب کے ذریعہ وحید میاں نے خاصا کام کیا اور نام پایا۔ ان کے معاصر مسائل جرائد نے صرف ”نقیب“ کو سراہا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر گراں قدر راتے کا اظہار کیا ہے چنانچہ ”امید لکھنؤ، جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں ”نقیب“ بدایوں پر تبصرہ کرنے ہونے رقمطراز ہے بلکہ

”نقیب“ (اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء) نقیب کے

اکتوبر نومبر ایک ساتھ اور دسمبر نمبر علیحدہ تینوں ایک ہی

ماہ کے اندر شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں پرچوں میں کسی مضامین قابل قدر

ہیں یہ روغن قاز“ از محمد عظمت اللہ خاں صاحب اوڑ عالم ارواح“ از سلطان حیدر

لہ نقیب جنوری ۱۹۲۰ء سے جنرل خدائش لائبریری پٹنہ نمبر ۱-۱۱ (۱۹۶۹ء)



دونوں مضامین دل چسپ ہیں اور اپنے رنگ میں اچھے ہیں... ”ہندوؤں کے مختلف مذاہب“ عزیز آسیونی نے ایک مفصل اور دل چسپ مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے ہنود کے مذاہب و فلسفہ سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے جو اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اہل اسلام بالعموم اس طرف سے لاپرواہ ہوتے ہیں، قابل تحسین ہے۔ محمد حسین صاحب نازش بدایونی نے حکیم مرزا آغا حسن ازل لکھنوی کا کلام اور بالخصوص ان کی مثنوی سحر عشق پر تبصرہ کیا ہے جو خوب ہے... انہی نمبروں میں حضرت اکبر الہ آبادی کا کچھ تازہ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ملک کی موجودہ صورت حال کو حضرت اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں چند اشعار میں خوب بیان کیا ہے نقیب کے دسمبر نمبر میں صرف ایک مضمون اچھا ہے علامہ اللہ صاحب افسر نے ”مہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم“ کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ صاحب مضمون صرف ایف اے کلاس کا طالب علم ہیں، مضمون قابل داد ہے۔“

وجید میاں، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد امجاد سے تھے، شیخ سلیم حشتی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بزرگوں میں تھے وہ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے خاصا ریاض کیا مختلف مشائخ، صوفیہ اور فقرا سے ملے ان سے گفتگو اور صحبتیں رہیں بعض مجاہدے اور ریاضتیں بھی کیں۔ بدایوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ شہر سے دور جنگل میں ہے۔ رات میں ہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا۔ وجید میاں راتوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ میں بھی رہے۔ مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی (وفات ۱۹۴۵ء) اس ذوق و جستجو میں ان کے شریک سفر رہے۔ بعض اوقات وجید میاں نے ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کی جو اب ذہن میں نہیں رہی۔

وحید میاں کا اخلاق اعلیٰ، طرز گفتگو ملائم اور حراج میں سادگی تھی۔ چھوٹوں بڑوں سب سے محبت سے پیش آتے۔ عجز و انکسار طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ برصغیر کے نامور اصحاب رشد و ہدایت سے عقیدت رکھتے تھے مولوی محمد امیر گیلانی (یکہ توت، پشاور) حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (لاہور) اور شاہ غریزی میاں نیازی (ربیلی) وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔ تصوف اور تاریخ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھنے کی بنا پر انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور مخدوم صاحب کلیری رحمۃ اللہ علیہ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔

وحید میاں خیر آباد کے دور آخر کے قلندریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شاہ مقبول انور قلندر (ف ۶ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ) سے بیعت تھے۔ صابری سلسلہ سے وہ نہایت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ صابری بھی لکھنے لگے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ خط خط حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کو لکھا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے خاص طور سے ان کی توجہ تصوف اور روحانیت کی طرف مائل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۸ء میں حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شریک ہوئے اور دیوان سید محمد سجادہ نشین پاک پٹن (ف ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۲ء) نے ان سے خاص تعلق اور محبت و شفقت کا اظہار کیا ہے۔

پہلی بھیت سے بدایوں آتے ہوئے ٹرین کے حادثہ میں ان کے کرپے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۱۱ جنوری ۱۹۶۱ء کو وحید میاں کا انتقال ہوا۔ (إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)

حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے آخری دور کی علالت اور انتقال کی کیفیت اپنے نام ان کی صاحبزادی قریشہ بیگم کے ایک خط کی روشنی میں اس طرح لکھی ہے:

۱۔ سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر از وحید مسعود (رضا پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء) ص ۶۴ و ص ۶۵ (۲۷۷ الے پڑھیے)

۵۔ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا کہ سردی کا اثر ہے۔ ۶۔ تاریخ کو آیت الکرسی کا ورد رہا کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۷۔ کو آیت کریمہ اس طرح پڑھی کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۸۔ کو یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم مسلسل پڑھتے رہے۔ ۹۔ کو سکوت کا عالم رہا۔ ۱۰۔ کو سیدھی جانب دیکھ کر کہتے یا خواجہ! الٹی جانب دیکھ کر کہتے یا بابا! اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے یا اللہ۔ شام کو کہا کہ اگر میرے بعد کوئی میری اولاد میں سے روئے گا تو میری رُوح کو تکلیف ہوگی، رات کو سات بجے کہا کہ آج ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خود شور یا پیا اور پانی خوب پیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی اور سو گئے مگر میرا بھائی وہیں رہا۔ ۱۲۔ بجے رات اٹھے اور تین مرتبہ پے درپے وضو کیا اور لیٹ گئے اور میرے بھائی سے کہا کہ مگرے کا دروازہ کھول دو، اس نے کھول دیا۔ پانچ آدمی مگرے کے اندر آگئے دو کو نہایت احترام سے اپنی سیدھی طرف بیٹھنے کو کہا اور تین کو اپنی الٹی جانب بیٹھنے کو کہا۔ پھر سائے دیکھ کر اپنے چہرے کو بالکل سائے ہاتھ ہلا کر کہا ابھی آتے ہیں ابھی آتے ہیں اور آواز بلند تین بار یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم پڑھا۔ پھر خوب آواز سے کلمہ پڑھا اور تین سانس لیں اور خالقِ حقیقی سے جملے: "رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔"

وجید میاں تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے تاریخ اور تصوف سے ان کو خاص لگاؤ تھا تحقیق کی طرف طبیعت کا خاص رجحان تھا۔ مگر انداز تحریر نہایت سنجیدہ اور ادیبانہ ہے بعض مضامین تو بلاشبہ انشائیہ کا نمونہ ہیں۔ کبھی شعر بھی کہتے تھے غالباً یہ جوانی کی بات ہوگی نمونہ ملاحظہ ہو۔

فلاق عالم محنتا رو توانا ہے تو آپ ہی سب کچھ ہے اور مثل سے بالا ہے

(نوٹ گذشتہ سے پیوستہ) اے سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (تعارف مصنف) از وجید احمد مسعود ناشر رضا پبلی کیشنز۔ لاہور۔

اضداد میں ممکن ہے اثبات میں کامل ہے  
 ہر شے کی حقیقت ہے ہر شے سے بڑا  
 مشہور تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا  
 مستور ہے جلوت میں خلوت میں ہوتا ہے  
 میں بندہ عاجز ہوں اور عجز پہ نازاں ہوں  
 کرتا جو تری مرضی ہو، مرضی تری اولیٰ ہے  
 یہ جدوجہد میری تسکین ہی تسکین ہے  
 ہوتا ہے وہی آخر جو کچھ ترا منشا ہے

اس نام کی خاطر سے احمدیہ کرم کرنا  
 ناکارہ وبے بس ہے لیکن ترا بندہ ہے

اب ہم وحید میاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

## تصوف

تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے رسالہ  
 "الناظر" لکھنؤ میں تصوف پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر وحید میاں نے  
 یہ رسالہ لکھا۔ اس کا اساس و بنیاد امام شہرانی کے رشتات قلم ہیں۔

## تصوف کی اصلیت

۴۸-۶۱۹۴۷ء میں مسلمانان ہند ایک عجیب دور ابتلا سے  
 گزر رہے تھے اس زمانہ میں انہوں نے یہ رسالہ لکھا اور بتایا  
 کہ انتشار و ابتلا کے دور میں صوفیہ نے کیسی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور انہوں نے ہر حال میں شرع کا ادب  
 کیا اور تصوف، کتاب و سنت سے مستحکم اور اخلاق انبیاء و اصفیاء کے سلوک پر مبنی ہے اور احکام شریعت  
 پر عمل کرنے کی ہر حال میں پابندی ہے۔ تصوف کے بعض دوسرے نکات و مسائل پر بھی نہایت سلجھے ہوئے  
 انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اپریل ۱۹۴۹ء میں نو لکھنؤ پریس  
 لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رضوی  
 انہوں نے اس کتاب میں عقیدت و روایت  
 سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی روشنی میں بلاصاف

رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی مددگار کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا مسودہ بھی اشاعت کی غرض سے خاکسار کو ارسال فرمایا میرے چھوٹے بھائی مرحوم محمد نعمت اللہ قادری (دف ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ء) نے اہتمام کے ساتھ پاک اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کیا اور علمی حلقوں میں کتاب مقبول ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن راقم الحروف کی تحریک پر رصدا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے محترمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے تعارف لکھا ہے۔

مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ  
**جمال صابر کلیری**  
 تقریباً خاموش ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ان

کی شخصیت کو متعین و مقبول بنایا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے ملفوظات و مکتوبات میں مخدوم صابر رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی حال یاد کرتا تک نہیں ہے وحید میاں کو اس سلسلہ سے خاص دل چسپی اور وابستگی تھی انہوں نے اس رسالہ میں ان کے حالات کی ترتیب و تدوین کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔

اس موضوع پر یہ رسالہ مفید اور معلوماتی ہے ۱۹۶۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ وحید میاں نے ایک تقسیمی مضمون بعنوان "پیر کلیر کے تذکرے" بھی لکھا تھا جو ہم نے رسالہ "بصائر" کراچی (جلد ۶، شماره ۱-۲) میں شائع کیا تھا۔

صابر کی تعلیمات | اپنے موضوع پر مکمل و مدلل کتاب ہے مگر طبع نہ ہو سکی۔

نواب فریدون (۱۹۶۶ء) نے ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء میں شیخوپورہ کی تعمیر کی بہت سی عمارتیں اور محل سراہیں بنوائیں اور خود پاک پٹن جا کر بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب تبرکات لائے اور انہیں اپنی خواب گاہ کے بالائے پختہ رکھے۔ چونکہ وہ تبرکات پٹاری میں رکھے جاتے تھے لہذا اسی نام سے موسوم ہو گئے اور حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے یوم وفات ۵ محرم کو ہر سال

شیخوپورہ میں ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ نواب مراد کے بیٹے حرم الدین نے نواب علی محمد خاں (د ۱۱۶۲ھ) کے پسر چہارم نواب محمد یار خاں امیر (د ۱۱۸۵ھ) سے جو شعر و تصوف کا ذوق رکھتے تھے، راہ رسم پیدا کی اور شیخوپورہ کی پٹاری کے کچھ تبرکات نواب محمد یار خاں کو پیش کر دیتے جب اہل خاندان کو اس کا ررواتی کا علم ہوا تو زیت کشت و خون بہت پہنچی۔

وحید میاں نے ”پٹاری“ کے عنوان سے ان تبرکات کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۵۴ء میں

نظامی پریس بلاوں میں طبع ہوا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے نظریہ وحدت الوجود کے مقابلہ میں نظریہ وحدت الشہود پیش کیا۔ وحید میاں نے اس رسالہ میں ہر دو نظریات

کو بیان کرتے ہوئے اول الذکر کی تائید کی ہے اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر گئی وغیرہ نے بھی رسائل لکھے ہیں۔ یہ تمام مواد ان کے سامنے رہا ہے یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

اس کتاب میں وسط ایشیا کے علاقوں اور قوموں میں اسلام کی تبلیغ، پس منظر، تاریخ اور اسلام پھیلانے والوں کی کاوشوں اور کوششوں کو

بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اپنے طور پر پھیلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اہل مشرق کی روحانیت پسند طبیعتوں کا بھی اسلام کو قبول کرنے میں فاسد دخل رہا ہے اس کتاب میں مغلوں کے اسلام لانے کا مختصر مگر جامع ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور کم تر فارسی ہیں اس موضوع پر اردو زبان میں یہ اولین کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کے لیے مواد اس وقت مہیا فرمایا تھا جب وہ یو۔ پی۔ گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

”میں یو۔ پی۔ گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے

مغلوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور متفرق نوٹ جمع کئے تھے۔ چنانچہ فہرست



میں ان سب کتابوں پر نمبر ڈال دیتے ہیں اور اس کتاب کے متن میں ہر اقتباس پر ماخذ کے نمبر کا حوالہ دے دیا گیا ہے تاکہ واقعات کی سند کا پتہ چل سکے ۱۹۵۲ء میں جب میں اس عہدے سے سبکدوش ہوا تو جمع شدہ نوٹوں کو مرتب و منسک کرنے کا خیال آیا۔ (ص ۲)

**منصوری** | کوہ منصور کی میر کے حالات دل چسپ اور ظریفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں پہلے مضمون رسالہ نقیب میں شائع ہوا اور بعد ازاں کتابچہ کی صورت میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں نقیب پریس بدایوں میں چھپا اور اشاعت پذیر ہوا۔

**محبت کی بلندیاں** | اسلامی تاریخ کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے یہ ڈرامہ ۱۹۵۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔

**نشہ کا اتارتا** | ہمارا خیال ہے کہ جب ۲۹-۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں کانگریسی وزارت وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ پہلے ہاشمی پریس بدایوں میں طبع ہوا پھر یو۔ پی گورنمنٹ نے شائع کیا۔

**آزیری مجسٹریٹ** | ان کے خاندان اور شہر بدایوں میں متعدد آزیری مجسٹریٹ تھے، خیال ہے کہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے نظرافت کے پیرایہ میں اظہار خیال کیا ہے۔

**عقل و عقیدہ** | مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تشریح و تنقید پر مشتمل ہے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

**دھوپ چھاؤں** | سیاسی ادبی اور ظریفانہ مضامین کا غیر مطبوعہ مجموعہ ہے۔

**انتخاب سالہ نقیب** | میر محفوظ علی بدایونی کے مضامین کا انتخاب جسے الناظر بکٹ ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

ادبی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جس زمانہ میں وہ پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس وقت  
**گردِ راہ** | یہ کتاب مرتب و شائع ہوئی چنانچہ ان کے صاحبزادے فرید احمد مرحوم لکھتے ہیں۔

”یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب والد صاحب قبلہ کے صرف وہ مضامین ایک جگہ

جمع ہو جائیں جو عالیہ ہیں اور قریب قریب لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین

فائلوں کے انبار سے آنکھیں چرا کر اور ملاقات کرنے والے اصحاب سے دامن پچا

کر جو لمبے میسر آسکے ان میں قلم بند کئے گئے ہیں اور سب کے سب گویا گردن دبا

کر لکھواتے گئے ہیں۔ یعنی احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً لکھے گئے

ہیں؛ مگر ان سے موجودہ زمانے کی روش اور تخیل کا ڈھنگ معلوم ہونے

اور کچھ نہیں تو ان مضامین سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرائض منصبی کی گونگاں

مصرفیتوں کے باوجود ادب کے حسین اور سکون بخش چشمے پر اس کے تشہل بہنچ

ہی جاتے ہیں۔ (پیش لفظ)

گردِ راہ میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

① انسان اقبال کی نظر میں ② غزل ③ اقبال اور نظریۂ سعی و عمل

④ میل ملاپ ⑤ ممبروں کے حقوق ⑥ بندرکاناچ ⑦ طلوع آزادی۔

⑧ بدایوں میں آزادی کے دن ⑨ اکبر کے لطیفے ⑩ فتح ممبین ⑪ عید

کے موقع پر گلے کی قربانی ضروری نہیں ⑫ مسلمان کیا کریں؟

⑬ دیوالی کا پیغام ⑭ گرونانک صاحب کافلنہ ⑮ ایک صلاح۔

اس کتاب پر تعارف قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے اور یہ کتاب رفیع احمد قدوائی کے

نام معنوں کی گئی ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپا اور جلد ہی دوسرا ایڈیشن

بھی شائع ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی جلا اور آزاد ہندوستان کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخوپور کے فریدی شیوخ کے اخبار و حالات میں اس خاندان کے مختلف بزرگوں نے لکھا ہے۔ بانی شیخوپور نواب فرید کے حالات مشہور ادیب

## عروج شیخوپور

سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۲ء) نے ”نواب فرید“ کے نام سے لکھے ہیں یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

وحید میاں کے پردادا شیخ فتح الدین ولد شیخ شمس الدین نے خاندانی حالات پر مشتمل فارسی زبان میں ایک رسالہ ۱۲۶۹ھ میں لکھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

” فقیر حقیر فتح الدین بن شمس الدین فریدی فاروقی شیخوپوری کہ ایں چند ورقیت در بیان حال حسب و نسب خود از شیخ شمس الدین تاحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ و تاحضرت آدم علیہ السلام و چند حالات و بیان دیگر متعلق ایں از کتاب جو اہر فریدی تصنیف شیخ علی اصغر و کتاب انور الثقلین تصنیف نواب کشور خاں و دیگر بزبانی بزرگان خود و دیگر ثقات شیخوپور و بدایوں وغیرہ انچہ کہ در سمع رسیدہ بود در ۱۲۶۹ ہجری القوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۲۶۰ فصلی و ۱۸۵۳ عیسوی برائے یادگار خود و دریافت برخورداران اقبال نشاناں شیخ شرف الدین و ذوالفقار الدین و مستجاب الدین بقید سلم آوردم“

اس رسالہ میں بقول وحید میاں، سحرے میاں نے اضافہ کیا لیکن یہ حالات مختصر و مبہم لکھے گئے ہیں پھر اس میں مزید اصل نے حکیم محمد جان مرحوم نے کئے جس کی ایک بوسیدہ نقل قادری میاں کے پاس بتائی جاتی ہے۔

وحید میاں نے شیخ فتح الدین کے رسالہ کی اساس و بنیاد پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دی ان کی نظر سے تھرے میاں اور حکیم احمد جان مرحوم کے بھی مخطوطے گزرے ہیں۔ وحید میاں نے اس کتاب میں شجرے اپنے زمانہ تک مکمل کر دیئے۔ اس میں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔

راقم الحروف محمد ایوب قادری جب اگست ۱۹۷۷ء میں بدایوں گیا تو وحید میاں نے

شیخ فتح الدین کا مولفہ رسالہ (تذکرہ خاندان شیبون شیخوپورہ) مع اپنے مسودہ کے مجھے مرحمت فرمایا۔

فاکس کرنے پر ۱۴۰۲ھ میں اس مسودہ کو صاف اور مرتب کیا اور جب غور کیا تو ”عروج شیخوپورہ“ سے ۱۹۸۳ء

برآمد ہوتے چونکہ اس مسودہ پر کوئی نام نہیں تھا لہذا میں نے اس کا نام ”عروج شیخوپورہ“ رکھ دیا ہے۔ وحید میاں

کے ہاتھ کا تحریر کردہ مسودہ میں نے اپنے دوست جمال الدین مونس نظامی لائبریریٹرز والقرنین، نظامی پریس

بدایوں (کوڑے دیبا جنہیں بزرگوں کے آثار جمع کرنے کا شوق ہے) ”عروج شیخوپورہ“ کی عکسی نقول سید شہید حسین

بدایونی، مونس نظامی اور کفیل الدین فریدی نے مجھ سے لیں۔

سید احمد شہید کی صحیح تصویر | سید احمد شہید بریلوی کی تحریک پر جعفر  
تھانیسری، ابوالحسن علی ندوی اور

غلام رسول مہر نے کام کیا ہے۔ سب سے زیادہ ضخیم کام مہر مرحوم کا ہے انہوں نے

سید صاحب کے خطوط اور ہم عصر مفصل کتاب منظور السعد سے خوب کام لیا ہے

ان بزرگوں نے عقیدت و ارادت کے قلم سے حسین تصویر کشی کی ہے۔ ضرورت تھی

کہ سیاسی و تاریخی پس منظر میں اس تحریک کا مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا وحید میاں

نے اسی نقطہ نظر سے یہ کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض اہم سوالات و

نکات اٹھائے ہیں اور دعوت غور و فکر دی ہے اگرچہ ان کے افکار وہ ہر نتیجہ

سے اتفاق رائے ضروری نہیں۔

یہ کتاب سب سے پہلے ”منادی“ دہلی کے ایک خاص نمبر (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی اور اس رسالہ کے مدیر خواجہ حسن ثانی صاحب نے دعوت دی کہ اس مبحث پر جو صاحب بھی اور خاص طور سے غلام رسول مہر صاحب لکھیں گے تو ”منادی“ میں ضرور شائع کیا جائے گا چنانچہ لوگوں نے مہر صاحب سے تقاضا کیا کہ وہ جواب لکھیں انہوں نے عذر کیا کہ ”منادی“ کا مذکورہ شمارہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ”منادی“ کے اس خاص شمارہ کا ذاتی نسخہ مہر صاحب کو پیش کیا بعد ازاں یہ خاص شمارہ اگست ۱۹۶۶ء میں لاہور سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ راقم الحروف چاہتا تھا کہ مہر صاحب اس کتاب پر اظہار خیال فرمائیں مگر وہ طرح دے گئے اور اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء میں ارقا فرمایا۔

” باقی رہا سید احمد شہید کا معاملہ تو بھائی صاحب اس عاجز نے اپنی زندگی کے

بیشتر سال اس تحریک کی چھان بین میں گزارے، بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں

کہ ”سید احمد شہید“ کے متعلق اتنی کتابیں شاید کسی نے دیکھی ہوں جتنی میں نے دیکھی۔

سید شہید کے مقامات جہاد اس تفصیل سے غالباً آج تک کوئی نہ دیکھ سکا لیکن

.... والوں کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ وقت گزر جاتا ہے تو چند الٹی سیدھی باتیں لکھ

کر ایک رسالہ چھاپ دیتے ہیں۔ اس نوع کی لغویات میں کون وقت

صرف کرے.... میں پچھلے دنوں بیمار ہو گیا نہ لسی بخار نے خاص تنگ کیا ابھی

صحت کاملہ نصیب نہیں ہوئی۔ بلغم کی تولید اور ایک حد تک انجامد کا سلسلہ ابھی

تک جاری ہے۔ ذرا طبیعت صاف ہو جائے تو ان شاء اللہ اس پر بھی لکھنا ہے

جس میں از سر نو مسئلہ کے بنیادی حقائق واضح ہو جائیں گے۔ بانفعل انتخابات کے

جھگڑوں میں سب لوگ مصروف ہیں۔ ان ہنگاموں میں نہ لیے مضامین چھپانے

کا کسی ہوش ہے اور نہ پڑھنے کا“

اس کے بعد جب مہر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری تو اطمینان ہو گیا کہ اس باب میں وہ کچھ نہ لکھیں گے لہ

” سر سید مرحوم نے مصلحت غلط باتیں کہی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ”دروغ مصلحت آمیز یہ از راستی فلسفہ انگیزہ“ کے قائل تھے۔ میں مجاہدین کی شان و آبرو و حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات یا توجیہات سے عین مطابق نہ ہو“

راقم الحروف کی درخواست پر ویدیاں ناپنے حالات بھی لکھے تھے مگر کچھ دنوں کے بعد تمہوں نے اطلاع دی کہ میں نے وہ کتاب ضائع کر دی، خدا کرے اس کا کوئی مسودہ وغیرہ کہیں محفوظ ہو تو وہ ایک علمی ادبی اور تاریخی شاہکار ہو گا جو ویدیاں کی مراسلت سیاسی، علمی اور ادبی حضرات سے ہوتی تھی ماس کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے خطوط جمع کئے جائیں۔

آخر میں ہم ان کی کتاب ”سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

سوانح خواجہ معین الدین احمد میری <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup> | بھٹیگر میں سے پہلے مسلمانوں کے قدم بند محمد کران میں پنپے اور محمد بن قاسم نے اس علاقہ میں اسلام

روشناس کرایا۔ دوسرا دور غزنویوں کے عہد اقتدار سے شروع ہوا۔ دولت غزنویہ میں موجودہ پاکستان کا کم و بیش تمام علاقہ شامل تھا۔ سیاسی اقتدار اور علماء و مشائخ کے قیام اور گشتوں کی بدولت جلد ہی یہاں اسلامی معاشرہ کو تقویت حاصل ہوئی۔ جگہ جگہ صدام مسجد اور مدارس قائم ہوئے۔ عربی فدرسی کی نشر و اشاعت ہوئی اور لاہو ایک اسلامی شہر بن گیا۔ عونی نے اپنے تذکرہ لبالب باب میں ایک باب فضائل غزنین و لاہوریہ لکھا ہے۔ ان شعرا میں الخالف فرج رونی (ف تقریباً ۵۸۰ھ مسعود سعد سلمان (۵۱۵ھ) شہور شاہزادہ ہیں ان ”نوں کے دیوان زیور طبع سے اراتہ ہو چکے ہیں۔ اس زمانہ میں لاہور میں شیخ حسین زنجانی، حضرت دامانگنج بخش اور شیخ اسماعیل محدث

لہ افادات مہر مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی (لاہور ۱۹۶۲ء) ص ۲۳۱-۲۳۲



جیسے صوفیہ و علما مقیم ہیں اور وہ تبلیغ و تذکیر کے فرائض انجام دے کر ان علاقوں میں اسلام کو سر بلند کر رہے تھے ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے برصغیر کی مختلف قومیں اور قبیلے مشرف باسلام ہوئے اور بہت سے خاندان اور صاحب حیثیت افراد مختلف دیار و امصار سے لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے اسلامی معاشرہ کو تقویت دی۔

جیسا کہ مبین خاں لاہوری لکھتے ہیں:

این سلسلہ ورود دانشمندان از افغانستان و ترکستان و ایران بہ پایہ تخت لاہور غزنویاں از عصر مسعود اول (بن محمود غزنوی تا آخر عصر ابراہیم غزنوی یعنی از سال ۳۲۱ھ تا ۴۹۲ھ تقریباً ہفتاد سال ادامه داشت تا آنکہ یک جم غفیر از دانشمندان و سخنوران فارسی گویاں در لاہور مستقلاً سکنی گزیدند؛

سید ہاشمی فرید آبادی پورے غزنوی دور پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ” نئے پایہ تخت لاہور میں ہم کئی اول درجہ کے صاحبان علم و فضل اور معیاری شعر کے نام سنتے ہیں جو دربار خسرو ملک کے متوسل تھے... بہر حال لاہور ہی سے امام صفحانی جیسے بزرگ استاد حدیث اور آداب الحرب و الشجاعت کا مشہور مصنف فخر مبارک شاہ منسوب کئے جائیں گے۔

علماء اور صدور میں چند نام ان کی شعر گوئی کی بدولت سلامت رہ گئے جیسے (۱) فصیح العجم العجوبۃ الزمان "سراج الدین منہاج" (۲) ثقفہ الدین جمال الفلاسفہ یوسف ابن محمد در بندی (۳) شہاب الدین محمد ابن رشید محتاج (۴) یوسف ابن

۱۔ تاریخ شعر و سخن دران فارسی در لاہور از مبین خاں لاہوری (نیشنل بک ہاؤس کراچی ۱۹۷۱ء)

۲۔ ماثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۱ء) ص ۱۳۵

نہر کاتب اور (۵) ضیاء الدین عبدالرافع طیب، ایک باکمال انشا پرداز اور شاعر  
جسے خسرو ملک نے قید اور آخر میں قتل کر دیا (۶) نصر اللہ فرقدی تھلہ خاص دہلی  
کے شعر میں علی ابن عمر اور ابو بکر خسروی کا تذکرہ ملتا ہے:

خوری حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ برصغیر میں ہشتیوں کا داخلہ ہوا اور ان کے قانڈ  
رہنا اور اس سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین ہشتی اجمیری ہیں۔ انہوں نے دیار ہند میں شجر اسلام کو بار آور  
کیا۔ ان کی قربانیاں اس اعتبار سے بے مثال ہیں کہ وہ رستے پتھور کی راجدھانی کفرزار اجمیر میں بیٹھ کر اصلاح  
معاشرہ میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو اللہ کے پیام سے روشناس کرنے لگے اور گویا "دُخْلُوْنَ فِيْ  
دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کا منظر پیش کر دیا۔ انہوں نے اپنے خلیقا کو گجرات، دکن اور شمالی ہند میں  
پھیلا دیا اور اصلاح و تبلیغ کی تحریک برپا کر دی۔

حضرت خواجہ معین الدین ہشتی کے احوال و آثار ہم عصر ماخذ اور تاریخی نوشتوں میں محفوظ  
نہ رہ سکے لیکن تعلیم اور اثر و نفوذ کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ سیر الاولیا پہلی کتاب ہے جس میں حضرت خواجہ  
کا ذکر تبرکاً ملتا ہے۔ فوائد الفواد اور خیر المجالس کے ذریعہ بات آگے بڑھتی ہے۔ سیر العارفين پہلا تذکرہ ہے  
کہ جس میں حضرت خواجہ کے حالات قدرے تفصیل سے پیش کئے ہیں اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس سے  
خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ سیر العارفين کے مؤلف نے سیر الاولیا، فوائد الفواد  
اور خیر المجالس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور شاخ چشت سے منسوب دیگر ملفوظات انیس الارواح  
دلیل العارفين، فوائد السالکين، اسرار الاولیا، راحت القلوب، افضل الفوائد، اور مفتاح العاشقين  
وغیرہ کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں کرتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یا تو یہ ملفوظات اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئے  
تھے یا جمالی نے ان کو خود ہی مسترد کر دیا۔

ظن غالب ہے کہ یہ مواد دُور مغلیہ میں وجود میں آیا کیونکہ اکبر اعظم نے پیادہ پا اجمیر جا کر مرکز

اجمیر کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ روسا، امراء اور شاہزادگان کی توجیہ ہوئی اکبری اور شاہجہانی تعمیرات اس کا بین ثبوت ہیں پھر حال عہد سلطنت میں یہ صورت حال نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری وغیرہ میں بھی حضرت خواجہ کا ذکر ملتا ہے۔

اردو زبان میں حضرت خواجہ کے حالات بعض غیر معروف مصنفین نے عقیدت و ارادت کے انداز میں لکھے اور غالباً عبدالباری معینی اجمیری پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ السلف (۱۹۲۵ء) لکھ کر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر عبدالباسط ایم۔ اے لکھتے ہیں یہ

”تاریخ السلف ایسی کتاب ہے جو اردو لٹریچر میں ایک نرالی حیثیت رکھتی ہے جناب مولوی عبدالباری صاحب معینی اجمیری نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تنقید کی ہے اور انہیں تاریخ کی روشنی میں لانے کی کوشش کی.... مصنف موصوف نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تاریخی اصول سے روشنی ڈالی ہے“

اس طرح کی دوسری کوشش غلام حسن زبیری نے معین الارواح (۱۹۵۲ء) لکھ کر کی وہ بھی تاریخ و تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھے ہیں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ایک مفصل اور ایک مختصر و صغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخوں میں بھی حضرت خواجہ کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ملتا ہے اس سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمن کی بزم صوفیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت و عزیمت اور شیخ محمد اکرام کی آپ کوثر قابل ذکر ہیں مگر تعجب ہے کہ مولف آپ کوثر نے ایک شخص ”معین الدین تولکی“ کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ قرار دے دیا۔ طبقات ناصری کی واضح عبارت ملاحظہ ہوئے

۱۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۲۶ء ص ۱۱۲

۲۔ طبقات ناصری از منہاج سراج (ترجمہ عبدالحی حبیبی) (کابل ۱۳۳۲ھ) ص ۳۲

ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد  
تولک و جبال بود لقب او معین الدین  
اومی گفت کہ من در آن شکر با سلطان  
غازی بودم، عدد سوارش کر اسلام  
در آن وقت صد و بیست ہزار گستاں بود

اس مؤلف نے ایک معتبر آدمی سے سنا کہ جو  
تولک اور پہاڑی علاقوں کے شہر کا سربراہ اور  
شخص تھا اس کا لقب معین الدین تھا وہ کہتا تھا  
کہ میں اس لشکر میں سلطان غازی کے ہمراہ تھا  
اور اسلام کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سواری

شیخ اکرام نے ثقہ از معارف بلاد تولک و جبال کو معلوم نہیں کس بنیاد پر حضرت خواجہ  
معین الدین چشتی اجمیریؒ تصور کر لیا۔

وجید مباح (شیخ وحید احمد مسعود) نے نہایت دقت نظر، محنت اور عصری و تاریخی منظر  
میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ حضرت خواجہ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر فارسی اردو اور  
انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے پیش نظر رہا ہے وہ تاریخ کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے  
نقل در نقل کی روایت کو رد کرتے ہوئے درایت کی روشنی میں حضرت خواجہ کے صحیح حالات پیش کرنے کی  
کوشش کی ہے۔

ان کی کتاب "سوانح خواجہ معین الدین اجمیری" ایک مفصل مقدمہ اور بائیس ابواب پر مشتمل  
ہے متن کتاب میں حسب موقع خاص خاص مآخذ پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے ان کی دقت نظر انداز  
ہوتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ اور اس کا تیسرا حصہ ابواب تصوف اور تاریخ تصوف کے اعتبار سے نہایت  
اہم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انہیں کامل عبور حاصل ہے ان کے دلائل نہایت واضح  
ہیں۔ تصوف قبل از اسلام، دور صحابہ، تدوین حدیث مشاہرات صحابہ، خلافت امویہ و عباسیہ ہائے اربعہ

۱۔ ملاحظہ ہو کتاب کوثر از شیخ محمد اکرام (فیروز سنز، لاہور ۱۹۵۲ء) ص ۲۲۶۔

کی دینی خدمات، عباسی دور میں مختلف مسائل و نظریات کا ظہور اور ان کا رد، تصوف کا تحریک کی صورت میں ظاہر ہونا اور اس کے ارتقا پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وحدت الوجود پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

حضرت خواجہ کے نام، مقام پیدائش، سنہ پیدائش، سفر، ہندوستان میں آمد، تبلیغ و اشاعت، اخلاق و عادات، عرض حیات خواجہ کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔ بلاشبہ فاضل مولف کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔

۱۹۶۰ء میں جب خاکسار بدایوں گیا تو انہوں نے اس کتاب کا مسودہ خاکسار کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا۔

پیر دم شو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

میں نے ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب سلمان اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کرادی مقام سرحدی کہ علمی و تاریخی حلقوں میں اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ نزعہ سے یہ کتاب نایاب تھی جناب محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی تحریک پر میاں محمد زبیر احمد صاحب قادری سجادہ نشین حضرت داماد گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (رضا پبلی کیشنز لاہور) اسے نہایت آب و تاب سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابیوں اور کامیابیوں سے نوازے یہ

محمد ایوب قادری  
۲۸ اگست ۱۹۸۳ء بروز اتوار

۹/۱۷۴/۸  
مارتھ ناظم آباد، کراچی

فقیر (میاں زبیر احمد) نے یہ تعارف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم سے جناب وحید احمد مسعود کی تصنیف "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" کے لئے لکھوایا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اب جناب وحید احمد مسعود کی تصنیف "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

## کتابیات

- |  |  |
|--|--|
| مولوی محمد جعفر تھانیسری                       | ۱۔ سوانح احمدی                         |
| مرزا حیرت دہلوی                                | ۲۔ حیات طیبہ                           |
| مولانا ابوالحسن ندوی                           | ۳۔ سیرت سید احمد شہید                  |
| مولانا غلام رسول مہر                           | ۴۔ سید احمد شہید                       |
| مولوی محمد جعفر تھانیسری                       | ۵۔ برکات اسلام                         |
| مولانا فضل رسول بدایونی                        | ۶۔ سیف الجبار                          |
| مولانا عبدالشاہد خان شروانی                    | ۷۔ باغی ہندوستان                       |
| سید احمد شہید رائے بریلوی                      | ۸۔ صراط مستقیم                         |
| شاہ اسماعیل دہلوی                              | ۹۔ تقویۃ الایمان                       |
| سید اشرف علی گلشن آبادی                        | ۱۰۔ تحفہ محمدیہ                        |
| مولانا احمد رضا خان و مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی | ۱۱۔ الاستمداد علی اجیال الارمداد       |
|  | ۱۲۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز              |
| شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس                    | ۱۳۔ موج کوثر                           |
| مولانا مناظر احسن گیلانی                       | ۱۴۔ سوانح قاسمی                        |
| شیخ عبدالحق محدث دہلوی                         | ۱۵۔ روضات                              |
| مولانا عاشق الہی میرٹھی                        | ۱۶۔ تذکرۃ الرشید                       |
| مولانا عبید اللہ سندھی                         | ۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک |
| مولانا احمد رضا خان بریلوی                     | ۱۸۔ الیاقوتۃ الواسطۃ                   |



- ۱۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔  
 ۲۰۔ تذکرہ علماء و مشائخ سرحد مولانا محمد امیر شاہ قادری پشاوری  
 ۲۱۔ امداد المصنوع مولانا اشرف علی تھانوی  
 ۲۲۔ ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی عبدالرزاق طبع آبادی  
 ۲۳۔ حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی  
 ۲۴۔ حالات کتب و بابیہ  
 ۲۵۔ الکوکتہ الشہابیہ مولانا احمد رضا خان بریلوی  
 ۲۶۔ مقالات سرسید حصہ شانزدہم  
 ۲۷۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا (انگریزی) از تارا چند

- 28- MILL'S, HISTORY OF INDIA VOL V.  
 29- MILL & NELSON, HISTORY OF INDIA 5TH EDITION VOL III.  
 30- A.B. KIETH, A CONSTITUTION HISTORY OF INDIA 2ND EDITION, 1937.  
 31- HISTORY OF ENGLAND IN THE 15TH CENTURY VOL 4TH.  
 32- NOTES ON INDIAN AFFAIRS VOL. 11  
 33- RECORDS OF INDIAN FACTS VOL 1  
 34. T.G. SPEAR, THE NOBLES.  
 35- THOMSON EDWORD, THE MAKING OF INDIAN PRINCES.  
 36- CAMBRIDGE, SHORT HISTORY OF INDIA.  
 37- REGENOL REYNOLD, THE WHITE SAHIBS OF INDIA.  
 38- R.C. DUTE, COMMITTEE OF CIRCUITS MINUTES SEP, 15-1925.  
 39- WOODRUF PHILIP, THE MAN WHO RULED IN INDIA, THE FOUNDERS.  
 40- LACKY, A HISTORY OF ENGLAND IN THE 15TH CENTURY VOL IV.

## فہرست

4	پیش گفتار
9	افتتاح سخن
13	فاتحہ
20	فاتحہ ثانی
21	ابتدائی حالات
24	بیعت کا افسانہ
33	بیعت کے بعد
35	سید صاحب پنڈاریوں میں
39	مذہبی انقلاب
41	ابن تیمیہ
43	ابن عبدالوہاب
45	شیخ احمد سرہندی
47	شاہ ولی اللہ
51	شاہ عبدالعزیز
58	شاہ اسماعیل
65	تبلیغی دورے
80	حج

104	سیاسی ماحول
121	جہاد
163	حقیقت واقعی
171	تعلیم
188	شاہ عبدالعزیز کا جواب
206	حلیہ
210	تعارف مصنف
240	کتابیات
242	فہرست

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ہماری خوبصورت علمی معیاری کتابیں

بزم اولیاء	امام عبداللہ بن اسعد یافعی	180 روپے
زیارت سرکارِ دو عالم ﷺ	حسن عمر شہاد	48 روپے
عین التعمیر ﷺ		
(حضرت کا ہر اسم گرامی مسدس میں منظوم) امداد نظامی		48 روپے
فاضل بریلوی اور امور بدعت	سید محمد فاروق قادری	100 روپے
اربعین حنفیہ	ابو یوسف مولانا محمد شریف کوٹلوی	36 روپے
شرح قصیدہ بردہ	علامہ نور بخش توکل رحمہ اللہ تعالیٰ	80 روپے
خطبات برطانیہ	علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی	120 روپے

**رضا پبلیکیشنز**

انارکلی۔ لاہور

marfat.com

Marfat.com



